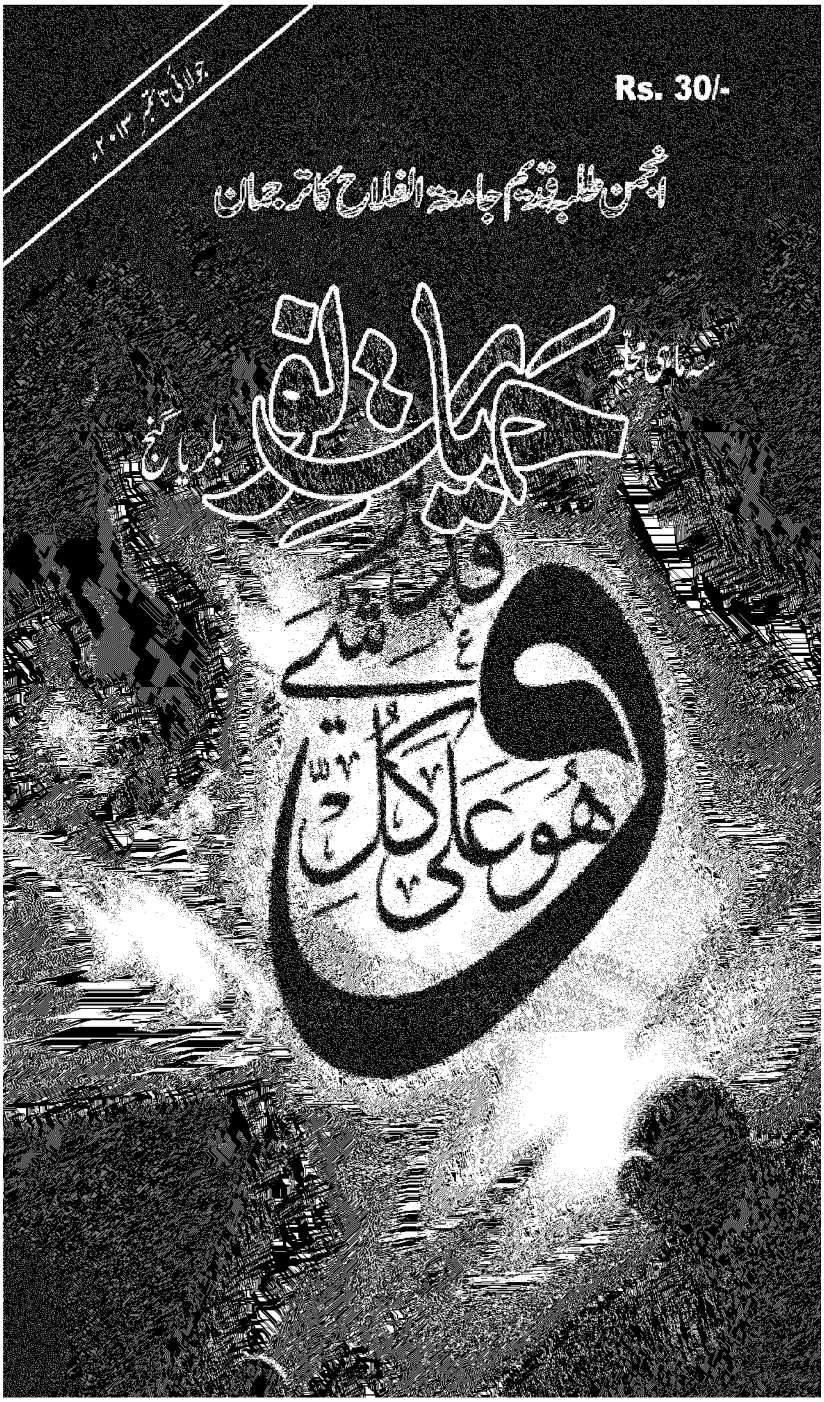

Rs. 30/-
جولائی تا ستمبر ۲۰۱۳ء
انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان
سہ ماہی مجلہ
حیاتِ نو
جلد پانچ
وهو على كل شىء قدير

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

حیاتِ نو

ج:۲۶ شمارہ:۳ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۳ء

مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

مجلس ادارت:

مشرف حسین صدیقی فلاحی	دہلی
مقبول احمد فلاحی	لکھنؤ
ضمیر الحسن خان فلاحی	علی گڑھ
مولانا محمد اسماعیل فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ :	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۱/۵امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون :	اندرون ملک	۱۲۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ :	اندرون ملک	۳۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

نمائندے

لندن	رضوان احمد فلاحی
دہلی	نعیم احمد غازی فلاحی
علی گڑھ	ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
ممبئی	حافظ ادہم علی فلاحی
نیپال	نذر الحسن فلاحی
یو.اے.ای.	خالد حسن رشید فلاحی
قطر	محمد اکرم فلاحی
کویت	محمد سموئیل فلاحی
سعودی عرب	انعام اللہ فلاحی

خط وکتابت کے پتے

برائے ادارتی امور
ابوالاعلیٰ سید سبحانی، نئی دہلی
abulaalasubhani@gmail.com
+91-9891051676

برائے انتظامی امور وترسیل زر
عرفان احمد فلاحی جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی) 276121
+91-9453757380
hayatenau5@gmail.com

نقوشِ حیات

اداریہ	مدیر	۵
عقیدۂ تقدیر ایک زندہ و حرکی تصور	سدید ازہر فلاحی	۷
میں اور میرا خاندان ہلاک ہو گیا ہوتا	نسیم احمد غازی فلاحی	۱۰
سیرت نبوی کا مطالعہ کیوں اور کیسے؟	ابوالمکارم ازہری فلاحی	۱۳
فارغین مدارس کا مطلوبہ کردار (خصوصی کالم)	رضوان احمد فلاحی	۲۱
	محمد اسماعیل فلاحی	۲۲
	ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی	۲۶
	شمشاد حسین فلاحی	۲۹
	ڈاکٹر محی الدین غازی	۳۰
	محمد الیاس خاں فلاحی	۳۲
	اشتیاق عالم فلاحی	۳۳
	دانش ریاض	۳۵
	عبید اللہ طاہر فلاحی	۳۷
اردو تراجم پر ایک تنقیدی نظر	ڈاکٹر محی الدین غازی	۴۰
کچھ تعلیم کے بارے میں	ڈاکٹر وسیم احمد فلاحی	۵۰
عالم عرب میں تبدیلی کی لہر	ڈاکٹر محمد ارشد	۵۲
مصر کا موجودہ سیاسی بحران، چند حقائق کا جائزہ	ابوالاعلی سید سبحانی	۵۵
غالب کی نثر نگاری اور ظرافت	راحت سلطانہ	۶۷
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے	سید راشد حامدی فلاحی	۷۰
تعارف و تبصرہ	تنویر آفاقی	۷۵
جامعہ کے لیل و نہار	مصباح الباری فلاحی	۷۶
شعر و نغمہ	ضمیر اللہ ضمیر فلاحی	۸۰
فارغین جامعہ متوجہ ہوں!	ادارہ	۸۱

اداریہ

اپنی بات

حیاتِ نو کا تازہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ یہ ایک کوشش ہے، وقت کے اہم علمی وفکری موضوعات پر فارغین جامعہ کے افکار وخیالات سامنے لانے کی۔ اس میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کا فیصلہ قارئین کریں گے۔

خوشی اس بات کی ہے کہ فارغین جامعہ وقت کے اہم علمی وفکری مسائل پر غور وفکر کرنے کے قائل ہیں۔ ہندوستانی سماج میں اسلام کی نمائندگی کا مسئلہ ہو، فلسفہ علم وتعلیم کے اسلامائزیشن کی بحث ہو، عالم اسلام اور عالم مغرب کے درمیان کشمکش کا موضوع ہو، یا عصر حاضر کے تناظر میں اسلام کی رہنمائی کی بات ہو، فارغین جامعہ ان تمام ہی موضوعات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

شاعرِ اسلام علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے نزدیک افکار تازہ کے بغیر جہانِ تازہ کا تصور ہی محال ہے۔ وہ جہان تازہ کی نمود کے لیے افکارِ تازہ کے وجود کو شرطِ لازم مانتے ہیں ؎

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

فی الواقع بات جہان تازہ کی ہو یا حیاتِ نو کی، اور یہ حیات کسی قوم کی ہو یا فردِ واحد کی، افکار تازہ کے بغیر اس کے وجود کا کوئی تصور ہی نہیں۔

امت اسلامیہ کی تو ترکیب ہی کچھ اس انداز سے ہوئی ہے کہ اُس کا ہر اگلا قدم تازہ تازہ افکار کا تقاضا کرتا ہے۔ دوسرے مذاہب اور اقوام سے اس کے امتیاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے سامنے زمان ومکان کی کوئی قید نہیں، سارا جہان اس کے فکر وعمل کی جولان گاہ، بلکہ اس کے فرضِ منصبی کا حصہ ہے، چنانچہ اس کے افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ سارے جہاں سے آگاہ ہوں، بلکہ اس کے سلسلہ میں فکر مند بھی ہوں۔

زمانے کی تبدیلی اپنے ساتھ بہت سی تبدیلیاں لے کر آتی ہے، اس کے اندر مثبت اور منفی دونوں ہی پہلو پائے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی بروقت اور سنجیدہ تدبیر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر بروقت اس تبدیلی کا

سامنا نہیں کیا جاتا، اور اس کو صحیح رخ نہیں دیا جاتا، تو زمانہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور زمانے کی امامت کا ''منصب'' رکھنے والے منبر ومحراب پاس موجود ہونے کے باوجود پیچھے جاتے چلے جاتے ہیں، شائد یہی حادثہ امت اسلامیہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔

ملت اسلامیہ ہند کا مسئلہ اور بھی نازک ہے، اس کے یہاں بحیثیت مجموعی کئی پہلوؤں سے سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔ ایک طرف خود ملت کے داخلی چیلنجز ہیں، جو یک گونہ اہمیت کے حامل اور قابل توجہ ہیں، دوسری طرف ملک کے عام سماج اور مسلمانانِ ہند کے درمیان موجود گہری خلیج کا مسئلہ ہے، جو دن بہ دن گہری ہی ہوتی جا رہی ہے، اور ان دونوں کے ساتھ ساتھ تیزی کے ساتھ رونما ہونے والی زمانی تبدیلیاں ہیں، جو ملت کے سوچنے اور سمجھنے والے افراد سے بروقت علمی وفکری رہنمائی کا مطالبہ کرتی ہیں۔

جس وقت تحریک اسلامی ہند کے چند افراد اعظم گڑھ کی ایک چھوٹی سی اور غیر معروف بستی میں جامعۃ الفلاح کی بنیاد رکھ رہے تھے، اس وقت ان کے پیش نظر ایسے ہی افراد کی تیاری تھی، جن کی قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ حالاتِ زمانہ پر گہری نظر ہو، اور جو ملت اسلامیہ ہند کی اپنے تازہ تازہ افکار وخیالات کے ذریعہ بحسن وخوبی رہنمائی کرسکیں۔ اس مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوسکی، یہ ایک الگ مسئلہ ہے، البتہ اس مقصد کے لیے جد وجہد جاری رکھنے کی ضرورت اُس وقت کے مقابلے میں اب اور زیادہ شدید ہوگئی ہے۔

حیاتِ نو اسی ضرورت کا احساس اور شعور عام کرنے کی ایک کوشش ہے۔

اس شمارے میں ''فکر وآگہی'' کے نام سے ایک نئے اور مستقل کالم کا آغاز کیا جا رہا ہے، جس کے تحت ملک وملت کے کچھ زندہ مسائل کو زیر بحث لانا پیش نظر ہے۔ تازہ شمارے میں اس کالم کے تحت مدارس اسلامیہ سے متعلق ایک اہم سوال کو زیر بحث لایا گیا ہے، اور آئندہ شمارے میں امت کے وجود کے سلسلے میں ایک اہم اور بنیادی مسئلہ زیر بحث لایا جائے گا، امید کہ اس کالم کو شوق کے ہاتھوں لیا جائے گا۔

فلاحی برادران کے دعوتی وعلمی تجربات اور مشاہدات بھی مجلّے کا مستقل حصہ رہیں گے۔ ملکی وعالمی حالات، اور فلسفہ علم وتعلیم پر بھی مستقل کالم شروع کیے گئے ہیں۔ آئندہ ماہ سے 'آپ کے خطوط' کا کالم بھی شروع کیا جائے گا۔ ان تمام چیزوں کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ایک سنجیدہ علمی وفکری ماحول پروان چڑھایا جائے، اور ایک دوسرے کے تجربات اور افکار وخیالات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کے مواقع سامنے لائے جائیں، واللہ ولی التوفیق وھو حسن المآب۔

ابوالاعلی سید سبحانی

عقیدۂ تقدیر

ایک زندہ وحرکی تصور

سدید ازہر فلاحی*

ایمانیات کا ایک اہم جز تقدیر پر ایمان ہے۔ یہ درحقیقت ایمان باللہ ہی کی ایک فرع ہے۔ ایمان باللہ جہاں خدائے واحد کی ذات کو تسلیم کرنے کا نام ہے وہیں خدا کی صفات، اس کے حقوق واختیارات پر ایمان بھی اس میں شامل ہے۔ اللہ تعالی پر ایمان لا کر آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس کی قدرت بے پناہ اور ہر چیز کو محیط ہے اور کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا ہر واقعہ اس کی طے کردہ اسکیم کے مطابق ہوتا ہے۔ تقدیر دراصل خدا کی اسی قدرت کاملہ کا اظہار ہے۔

تقدیر کے مسئلہ کو سمجھنے میں عموماً لوگوں کو بڑی الجھن پیش آئی ہے۔ ایک گروہ نے اس سلسلہ میں یہ موقف اختیار کیا کہ ہر چیز خدا کی طرف سے طے شدہ ہے۔ انسان مکمل طور پر مجبور ہے۔ اسے اچھا یا برا عمل اختیار کرنے کی آزادی نہیں ہے۔

دوسرے گروہ نے کہا کہ انسان اگر مجبورِ محض ہے تو پھر ابتلا وآزمائش چہ معنی دارد؟ لہذا تقدیر نام کی کوئی چیز نہیں، تدبیر ہی اصل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر چیز مقدر ہے اور اس تقدیر کے آگے انسان مکمل طور پر مجبور ہے تو اس سے خدا کے سلسلہ میں نعوذ باللہ ظلم لازم آتا ہے۔ (اس لئے کہ انسان کو مجبور محض بنا کر اس کی آزمائش کرنا اور برے اعمال پر اسے سزا دینا صحیح نہیں ہے) جب کہ اللہ تعالی ہر قسم کے ظلم کے شائبہ سے پاک اور منزہ ہے۔ **اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِیْد** ''اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا''۔

دوسری جانب اگر یہ کہا جائے کہ انسان مکمل ارادہ واختیار کا مالک ہے اور اپنی زندگی کے تمام امور پر

اسے تصرف حاصل ہے تو اس سے شرک لازم آتا ہے۔ اس لئے کہ خدا کی ہستی قادر مطلق ہے۔ کائنات کی ہر چیز پر اسی کا تصرف ہے۔ اس کے ارادہ میں کوئی مانع نہیں ہوسکتا۔

قرآن اس مشکل کی عقدہ کشائی یوں کرتا ہے:

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ. لِمَن شَاء مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ. وَمَا تَشَاؤُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (سورة التكوير:29-27)

''یہ تو بس ایک یاددہانی ہے دنیاوالوں کے لئے۔ ہر اس شخص کے لئے جو راہ راست اختیار کرنا چاہے۔ اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا الاّ یہ کہ اللہ، ساری دنیاوالوں کا رب، چاہے۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں دو ارادے کام کرتے ہیں۔ ایک خدا کا ارادہ اور دوسرا انسان کا ارادہ۔ خدا کا ارادہ مطلق (Absolute) ہے اور انسان کا ارادہ محدود اور مقیّد ہے۔ انسان کا ارادہ خدا کے ارادے کے تابع ہے۔ یہ خدا کے ارادے میں مانع نہیں ہوسکتا۔

تقدیر کے سلسلے میں سورۂ الحدید کی یہ آیات بھی نہایت اہم ہیں:

مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ. لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (سورة الحديد:23-22)

''روئے زمین پر جو بھی مصیبت آتی ہے یا تمہاری جانوں کو جو بھی مصیبت لاحق ہوتی ہے وہ ایک نوشتہ میں ثبت ہوتی ہے قبل اس کے کہ ہم اسے معرض وجود میں لائیں۔ یہ بات اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔ (یہ اس وجہ سے ہے) تاکہ جو کچھ تم سے فوت ہو جائے تم اس پر رنجیدہ نہ ہو اور جو کچھ تمہیں ملے اس پر نہ اتراؤ۔ کیونکہ اللہ ہر بڑائی جتانے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ عقیدۂ تقدیر سے ناآشنا انسان اپنی زندگی میں عموماً دو رویے اختیار کرتا ہے۔ حزن اور فرح (اترانا)۔ جب اسے کوئی مصیبت لاحق ہوتی ہے تو وہ حزین و رنجیدہ ہوتا ہے اور جب اسے کوئی اچھی چیز ملتی ہے تو وہ اترانے لگتا ہے۔ عقیدۂ تقدیر پر ایمان رکھنے والا شخص ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا رویہ اس کے بالکل برخلاف ہوتا ہے۔ وہ حزن و فرح کے بجائے صبر و شکر کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ بندۂ مومن کے اس وصف امتیازی کی تصویر حدیث میں یوں کھینچی گئی ہے:

عَجَباً لِاَمْرِ الْمُؤمِنِ. اِنَّ اَمْرَهُ كُلُّهُ لَهُ خَيْرٌ. اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْراً لَّهُ. وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْراً لَّهُ.

''مومن کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے! لاریب اس کی شان یہ ہے کہ ہر چیز اس کے حق میں اچھی ہے۔ اگر

اسے کوئی خوشی میسر آتی ہے تو وہ شکر کا رویہ اختیار کرتا ہے اور یہ چیز اس کے حق میں اچھی ہوتی ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت لاحق ہوتی ہے تو وہ صبر کا رویہ اختیار کرتا ہے اور یہ چیز بھی اس کے حق میں اچھی ہوتی ہے۔"

ارادۂ مطلقہ (Absolute Will)، جہاں انسان کی مشیت کام نہیں کرتی بلکہ صرف خدا کا ارادہ کارفرما ہوتا ہے، وہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان صبر وشکر کا رویہ اختیار کرتا ہے یا حزن وفرح کا۔ اس کے اسی رویے پر جزا اور سزا کا دار ومدار ہوتا ہے۔ ارادۂ مقیدہ، جہاں انسان کو اختیار وعمل کی محدود آزادی میسر ہوتی ہے، وہاں اعمال پر جزا وسزا کا قانون لاگو ہوتا ہے۔ اگر انسان اپنے ارادہ واختیار سے خیر کو اپنائے تو اسے ثواب ملتا ہے اور اگر وہ شر کی طرف مائل ہو تو اسے عقاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس طرح اسلام کا عقیدۂ تقدیر ایک معقول اور عملی عقیدہ ہے۔ یہاں تدبیر کی بھی اپنی حدیں مقرر ہیں اور تقدیر کے سلسلے میں مطلوبہ رویے پر واضح رہنمائی بھی موجود ہے۔ دیگر مذاہب میں عقیدہ کا مطلب چند باتوں پر اندھا یقین ہوتا ہے، ایسا یقین جو انسانی زندگی پر کوئی مثبت اثر نہیں چھوڑتا۔ اس کے بالمقابل اسلامی عقائد بے جان نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ وہ زندہ اور حرکی عقائد ہوتے ہیں۔ اسلامی عقائد سے زندگی راست طور پر متاثر ہوتی ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر میں ان کا نہایت اہم رول ہوتا ہے۔ عقیدۂ تقدیر بھی انہی زندہ وحرکی عقائد میں سے ایک ہے۔ تقدیر کے اسلامی تصور پر عقیدہ رکھنے والا نہ حزن ورنج میں مبتلا ہوتا ہے، نہ کسی خیر کے ملنے پر اتراتا اور گھمنڈ کرتا ہے۔ حزن اور فرح دونوں برائیوں کی جڑ ہیں۔ حزن نفسیاتی مسائل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ ڈیل کارنیگی نے اپنی کتاب "How to stop worrying and start living" میں عربوں کے بارے میں لکھا ہے کہ انہیں جب بھی کوئی چھوٹی یا بڑی مصیبت پیش آتی تو وہ کہتے "مکتوب! مکتوب!"۔ یعنی یہ کہ یہ واقعہ ناگہانی نہیں ہے بلکہ نوشتۂ تقدیر میں ثبت ہے۔ اس طرح وہ حزن اور قلق میں مبتلا ہونے کے بجائے مصائب ومشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے۔ یہ ذہنی ساخت اسلام ہی کی تشکیل کردہ ہے۔

تدبیر کا ایک الگ دائرۂ کار ہے اور تقدیر کا ایک الگ دائرۂ کار۔ تدبیر کے دائرۂ کار میں صحیح عمل مطلوب ہوتا ہے اور تقدیر کے دائرۂ کار میں صحیح ردِّعمل۔ صحیح عمل ہی کی طرح صحیح ردِّعمل کی بھی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ انسانی زندگی میں ایسے گوناگوں واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ یہ واقعات بجائے خود اہم نہیں ہوتے بلکہ ان واقعات پر انسان کا ردِّعمل اصل ہوتا ہے۔ اسی ردِّعمل پر اخروی نتائج کا مدار ہوتا ہے۔ حزن اور فرح ایک ردِّعمل ہے اور صبر وشکر دوسرا ردِّعمل۔ پہلا ردِّعمل غلط ہے اور دوسرا صحیح۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تدبیر کے دائرے میں انسان کے سامنے عمل کا وسیع میدان ہوتا ہے اور تقدیر کے دائرے میں انسان کا رویہ تشکیل پاتا ہے۔

*استاد الجامعہ الاسلامیہ، شانتاپرم، کیرلا

میں اور میرا خاندان ہلاک ہوگیا ہوتا

نسیم احمد غازی فلاحی*

ایک بار جناب توسل حسین صدیقی مرحوم (رام پور، یوپی) کے گھر بغرض ملاقات جانا ہوا۔ گھر کے باہر موجود ان کے ملازم نے مجھے بتایا کہ صدیقی صاحب ڈرائنگ روم میں کچھ پروفیسر حضرات کے ساتھ محو گفتگو ہیں۔ یہ حضرات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تبلیغی مشن پر آئے ہوئے ہیں۔ ملازم نے مجھ سے بھی اندر چلے جانے کو کہا۔ میں سلام کرکے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں بیٹھے سبھی لوگوں نے پرجوش انداز میں میرے سلام کا جواب دیا۔ جناب توسل صاحب مرحوم نے مجھے اپنے پاس رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے بیٹھتے ہی موصوف نے حاضرین سے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ برادران وطن میں اسلام کی دعوت کا کام کرتے ہیں، ''برادران وطن میں اسلام کی دعوت'' یہ سنتے ہی سفید کرتے پاجاموں میں ملبوس حاضرین میں سے دوتین حضرات نے مجھ سے ایک آواز میں فرمایا ''نسیم صاحب! پہلے اپنی (مسلمانوں کی) اصلاح تو کرلی جائے اور اس کے بعد ہی غیرمسلموں میں اسلام کی دعوت کا کام ہونا چاہئے''۔ ان پروفیسرس کی یہ بات سن کر مجھے سخت جھٹکا لگا۔ میرے خیال میں ان حضرات کو میرے کام پر تبصرہ کرنے اور مجھے مشورہ دینے میں اتنی عجلت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ تھوڑا توقف فرماتے اس کے بعد مشورہ دیتے تو بہتر تھا۔ اس لئے کہ میں ان کے لئے ایک اجنبی تھا اور وہ میرے لئے۔ بہرحال وہ لوگ ''تبلیغی مشن'' پر نکلے تھے اس لئے انہوں نے بلا کچھ تاخیر کئے میری رہنمائی کرنا ضروری خیال کیا ہوگا۔ جناب توسل صاحب (مرحوم) نے بھی جو نہایت سلیم الطبع انسان تھے ان حضرات کی اس بات کو محسوس کیا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ ان حضرات کی بات کو نظرانداز کردیا جائے لیکن معاً مجھے خیال ہوا کہ ان لوگوں کی غلط فہمی کو دور کرنا نہایت ضروری ہے، ورنہ نہ جانے کتنے لوگوں کو یہ حضرات گمراہ کریں گے۔ چنانچہ میں نے ذرا بلند آواز میں افسوس ظاہر کرتے ہوئے عرض کیا ''اگر آپ حضرات کی اس بات پر لوگ عمل کرتے تو میں اور میرا خاندان ہلاک ہوگیا ہوتا۔'' میں نے یہ جملہ مسلسل دوتین بار بلند آواز

میں دہرایا۔ ان پروفیسر حضرات میں سے ایک صاحب نے بڑی حیرت کے ساتھ پوچھا کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ آپ ہلاک کیوں ہوگئے ہوتے؟ وہاں موجود ان کے دیگر ساتھی بھی ان کے اس سوال میں شریک تھے۔ میں نے اشارے اشارے میں میزبان جناب توسل صاحب سے اس بات کا جواب دینے کی اجازت چاہی۔ موصوف نے بآواز بلند مجھ سے فرمایا کہ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بلا تکلف کہیں۔ میں نے اپنے سامنے رکھے پانی کے گلاس سے دو گھونٹ پانی پیا اور پھر عرض کیا:

''بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک غیر مسلم خاندان میں پیدا ہوا۔ ہمارا خاندان مذہبی خاندان تھا۔ ہم لوگ مذہب کے نام پر بت پرستی اور طرح طرح کے خداؤں کی عبادت کرتے تھے۔ ہمارا عقیدہ تھا کہ ہمارا ہی دھرم سچا دھرم ہے، اس لئے ہمیں اپنے دھرم پر بڑا فخر تھا۔ حرام وحلال کی ہمیں کوئی تمیز نہ تھی جس چیز کو چاہا حلال کرلیا اور جس کو چاہا حرام۔ اس دنیا میں ہمیں کیوں بھیجا گیا ہے اور مرنے کے بعد ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ ہمیں اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ہم اپنی من مانی زندگی بسر کررہے تھے۔ مسلمانوں کے بارے میں ہماری رائے تھی کہ وہ وحشی، گندے اور ناپاک لوگ ہیں۔ ہمارا یہ بھی خیال تھا اور یہ خیال ہمارے بڑوں نے ہمارے دل ودماغ میں بٹھایا تھا کہ مسلمانوں کے مذہب اسلام کا شمار تو دھرم میں ہوتا ہی نہیں۔ ہمارے کچھ مسلمان ساتھی کالج میں بھی تھے اور محلے میں بھی۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی اور کسی بھی موقع پر اسلام کے بارے میں کوئی گفتگو ہم سے نہیں کی۔ شاید وہ ''پہلے اپنی اصلاح کرلیں اس کے بعد دوسروں میں تبلیغ کریں'' کے اصول پر کاربند رہے ہوں گے۔ اتفاق سے ہمارا واسطہ کچھ ایسے مسلمانوں سے پڑا جو رب کا پیغام دوسرے انسانوں تک بھی پہنچانے کے قائل تھے۔ انہوں نے ہمیں اسلام کے بارے میں بتایا، نیز اسلام کے متعلق کچھ کتابیں پڑھنے کو دیں۔ ان کی گفتگو سے اسلام کے بارے میں ہمارا تجسس بڑھا۔ ہم نے بہت سے سوالات ان سے کئے جن کے جوابات بڑے تشفی بخش انداز میں انہوں نے دیئے۔ ساری انسانیت کو جہنم سے بچانے اور جنت کا مستحق بنانے کی فکر اور تڑپ رکھنے والے ان مسلمانوں نے ہمیں قرآن مجید کا ترجمہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر کچھ کتابیں بھی مطالعے کے لیے دیں۔ ان کے مطالعے کے بعد ہماری آنکھیں کھل گئیں اور ہم نے یہ جان لیا کہ ہمارے خالق اور مالک کا بھیجا ہوا دین حق اسلام ہی ہے جس کو قبول کئے بغیر اور جس پر عمل کئے بغیر اخروی نجات ممکن نہیں۔ آخرت میں ان لوگوں کے لئے بڑی تباہی اور بربادی ہے جو کفر اور شرک میں مبتلا ہیں۔ اس تصور سے ہم کانپ اٹھے، پچھلی زندگی پر شرمندہ اور افسردہ ہوئے اور رب کی توفیق سے ہمارے خاندان کے سبھی لوگ اس کے دین رحمت میں داخل ہوگئے۔ اس امید اور یقین کے ساتھ کہ ہمارا پروردگار ہماری سابقہ غلطیوں کو معاف کرے گا اور ہمیں جہنم سے نجات دلا کر جنت یعنی اپنی رحمت میں

جگہ دے گا۔''

یہ بات عرض کرنے کے بعد چند لمحے میں خاموش رہا۔ اس کے بعد میں نے پھر عرض کیا ''میں آپ لوگوں سے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگران مسلمانوں نے اس بات پر عمل کرتے ہوئے ''پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرلو، اس کے بعد ہی غیر مسلموں تک دین حق پہنچاؤ'' ہم تک دین رحمت، اسلام کی تعلیمات نہ پہنچائی ہوتیں تو ہم اس نور ہدایت سے محروم ہی رہتے اور بالآخر ہلاک وتباہ ہوجاتے۔''

میں اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگیا۔ کمرے میں بیٹھے سبھی لوگوں نے میری گفتگو کو بڑی توجہ اور یکسوئی سے سنا اور اب وہ بھی بالکل خاموش تھے گویا ان کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔ چند لمحوں کے بعد خاموشی کو توڑتے ہوئے حاضرین میں سے ایک صاحب نے بڑی حوصلہ مندی اور جرأت کے ساتھ تسلیم کیا کہ یقیناً ہم لوگ غلطی پر تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی اصلاح بھی کرنی ہے اور برادران وطن تک دین حق کو پہنچانا بھی ہے۔ یہ ہمارا فرض منصبی ہے۔ وہاں موجود سبھی لوگوں نے ان صاحب کی تائید کی۔ اس پر صاحب خانہ جناب توسل صاحب کی زبان سے بس یہ الفاظ نکلے ''جزاکم اللہ! جزاکم اللہ'' مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا، اس لئے لوگ سلام اور مصافحہ کر کے رخصت ہوگئے۔

*مدھر سندیش سنگم، نئی دہلی

بقیہ : عالم عرب میں تبدیلی کی لہر..................................

بلاشبہ مصر میں حالات کافی خراب ہیں، یہ بھی کہا جارہا ہے کہ اخوانیوں کے خلاف قتل وغارت گری اور گرفتاریاں ناصر کے زمانے سے بھی آگے بڑھ چکی ہیں۔ اس طرح کے شبہات بھی ظاہر کیے جارہے ہیں کہ اسلام پسندوں کو مصر میں شائد ایک بار پھر طویل عرصے کے لیے دبا دیا جائے، ان کی قیادت کو ختم کردیا جائے اور ان پر پابندیاں عائد کردی جائیں۔ موجودہ حالات اور اس پس منظر میں شکوک وشبہات اپنی جگہ، لیکن اِنہی حالات میں اور شکوک وشبہات کے درمیان امکانات کی راہیں اور امید کی قندیلیں بھی روشن ہیں۔ اخوان اب کوئی چھوٹا سا مذہبی گروپ نہیں، ایک عوامی تحریک ہیں، جو روحانی غذا اسلام کے اصولوں سے حاصل کرتے ہیں۔ باطل انہیں تاریکی میں ڈھکیل دینا چاہتا ہے، لیکن شائد اسے معلوم نہیں کہ ہر تاریکی کی ایک سحر ہوتی ہے، اور بقول شاعر

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی، موبائل نمبر: ۹۲۱۳۳۳۴۱۷۷

سیرت نبویؐ کا مطالعہ - کیوں اور کیسے؟

ابو المکارم فلاحی ازہری*

سیرت نبویؐ کا مطالعہ کیوں اور کیسے؟ یہ بہت ہی اہم اور وسیع موضوع ہے۔اس موضوع کے دو اجزاء ہیں، پہلے جزء کے تحت مطالعہ سیرت کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالی جائے گی اور اس پر گفتگو ہوگی کہ سیرت کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے کیوں ضروری ہے؟ اور غیر مسلموں کے لیے کیوں ضروری ہے؟ دوسرے جزء کے تحت یہ بتایا جائے گا کہ سیرت کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟ اس کے کیا کیا ذرائع ہو سکتے ہیں اور اس کے اہم مراجع کیا ہیں؟

یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل واحسان ہے نہ صرف امت مسلمہ پر بلکہ پوری انسانیت پر کہ اس نے سیرت نبوی کی حفاظت کا ایسا مکمل اور بہترین انتظام فرمادیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ، ہر واقعہ، آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ، آپ کی حرکات وسکنات اور آپ کی جلوت وخلوت کا ایک ایک عمل پوری طرح محفوظ ہے۔ آپ کی پوری زندگی قیامت تک کے لیے محفوظ کردی گئی ہے۔اور ایسا ہونا ضروری اور لازمی بھی تھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء کرام علیہم السلام کے سلسلہ کی آخری کڑی ہیں، اور آپ دین کامل لے کر دنیا میں آئے۔ آپ کی لائی ہوئی شریعت اتنی جامع اور مکمل ہے کہ قیامت تک پیش آنے والے تمام انسانی مسائل کا صحیح اور مکمل حل پیش کرتی ہے۔بس ضرورت اس بات کی ہے کہ سیرت کا مطالعہ اس نیت وارادہ کے ساتھ کیا جائے کہ زندگی گزارنے کے لیے اس سے رہنمائی حاصل کرنی ہے اور ہر مرحلہ میں آپ کی زندگی کو اسوہ اور نمونہ بنانا ہے۔

مسلمانوں کے لیے مطالعۂ سیرت کی ضرورت :مسلمانوں کے لیے سیرت نبوی سے واقفیت اور اس کا مطالعہ صرف ایک علمی مشغلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک دینی ضرورت اور اسلامی فریضہ ہے۔اس کے بغیر ایک مسلمان اسلام اور قرآن کو پورے طور پر نہ تو سمجھ سکتا ہے اور نہ قرآنی احکام وتعلیمات پر صحیح طور پر عمل کرسکتا ہے۔اس حقیقت کی وضاحت آگے آنے والے نکات سے بخوبی ہوجائے گی۔

۱- ایمان بالرسالت ایمان کا اہم رکن ہے: کلمہ طیبہ کا دوسرا جزء ''محمد رسول اللہ'' ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی توحید کے اقرار کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ایک مسلمان کے لیے جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان میں دوسرے نمبر پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس شخصیت پر ایمان لائے بغیر آدمی کا ایمان مکمل ہی نہیں ہوسکتا کیا اس کی زندگی کے حالات اور اس کی سیرت و دعوت کو جاننا ضروری نہیں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ جس شخصیت پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لیے شرط ہے اور جس کی اتباع کا اسے حکم دیا گیا ہے اس کی سیرت اور زندگی کے حالات جانے بغیر اس کا اتباع ممکن نہیں ہے۔ اس لیے سیرت نبوی کا مطالعہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ قرآن پاک میں اللہ کا ارشاد ہے: ''فَـآمِـنُـوا بِـاللّٰـهِ وَرَسُـولِـهِ الـنَّبِـيِّ الْأُمِّـيِّ الَّـذِي يُـؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُون'' (سورہ الاعراف: ۱۵۸) ترجمہ: ''پس اللہ پر اور اس کے رسول، نبی امی پر ایمان لاؤ جو اللہ پر اور اس کے کلمات یعنی احکام پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کا اتباع کرو تاکہ تم سیدھی راہ پر آجاؤ۔''

۲- سیرت نبوی قرآن کی عملی تفسیر ہے: یہ حقیقت ہے کہ قرآن پاک کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے سیرت کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں ''اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحبِ قرآن کی سیرت ہے، اور دراصل قرآن اور حیاتِ نبوی معناً ایک ہی ہیں۔ قرآن متن ہے اور سیرت اس کی تشریح، قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل، قرآن صفحات وقراطیس ما بین الدفتین اور فی صدور الذین اوتو العلم ہے، اور یہ ایک مجسم وممثل قرآن تھا جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ کما قالت الصدیقة رضی الله عنها: "وکان خلقه القرآن"۔ (رسول رحمت)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی کتاب ''سیرت سرور عالم'' میں لکھا ہے: ''ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہوسکتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے سمجھے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا اس نے اسلام کو سمجھا، ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجۃً ہدایت سے بھی۔'' (جلد اول ص: ۳۵، مقدمہ)

یہ حقیقت ہے کہ قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ نے نصیحت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے لیے آسان کر دیا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے۔ ''ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر'' (سورۃ القمر: ۱۷) لیکن جب ہم قرآن پاک کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سے مقامات ایسے آتے ہیں

جہاں قرآن پاک میں اجمال کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، یا بعض ایسے واقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جو نزول قرآن کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہ کرامؓ کے ساتھ پیش آئے، ان میں سے اکثر واقعات بعض آیاتِ قرآنی کے شان نزول کے طور پر کتب تفسیر وحدیث اور کتب سیرت میں موجود ہیں۔ان واقعات کو جانے بغیر ان سے متعلق آیات کریمہ کو پورے طور پر سمجھنا مشکل ہے۔اور وہ واقعات چونکہ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے دوران پیش آئے اس لیے ان کا براہ راست تعلق سیرت نبوی سے ہے، اگر چہ ان کا ذکر تفسیر وحدیث کی کتابوں میں بھی ملتا ہے، مثال کے طور پر:

الف) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’ الم۔ غُلِبَتِ الرُّوم۔ فِیۡ أَدۡنَی الۡأَرۡضِ وَهُم مِّن بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُون ‘‘۔ (سورۃ الروم:۱-۳) ان آیات میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جب رسول اللہؐ کے زمانہ میں فارس اور روم کی دو عظیم سلطنتوں میں سے فارس کو روم پر غلبہ حاصل ہوا تھا، پھر قرآن نے یہ خبر دی کہ چند ہی سال کے اندر رومی دوبارہ فارس پر غالب آجائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور قرآن پاک کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

ب) اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے: ’’وَعَلَى الثَّلاَثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُواۡ حَتَّى إِذَا ضَاقَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡأَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ وَضَاقَتۡ عَلَيۡهِمۡ أَنفُسُهُمۡ وَظَنُّواۡ أَن لَّا مَلۡجَأَ مِنَ اللّهِ إِلَّا إِلَيۡهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوبُواۡ إِنَّ اللّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ‘‘۔ (سورۃ التوبہ:۱۱۸)

اس آیت کریمہ میں ان صحابہ کرامؓ کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے جو صرف تساہل کی وجہ سے غزوہ تبوک میں شرکت نہ کر سکے تھے۔ان کا تفصیلی واقعہ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے، ان کے نام یہ ہیں: حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت مرارہ بن ربیع اور حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم۔

ج) اسی طرح ایک جگہ مذکور ہے: ’’ قَدۡ سَمِعَ اللَّهُ قَوۡلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوۡجِهَا وَتَشۡتَكِي إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ يَسۡمَعُ تَحَاوُرَكُمَا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ‘‘۔ (سورہ المجادلۃ:۱)

اس آیت کریمہ میں اشارہ ہے حضرت خولہ بنت مالک رضی اللہ عنہا کے واقعہ کی طرف جن کے شوہر حضرت اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے ان سے ظہار کر لیا تھا۔ یہ واقعہ ہمیں حدیث اور سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، قرآن کریم میں صرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح اور بہت سی آیات ہیں جن میں مختلف واقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ جیسے واقعہ افک، صلح حدیبیہ، فتح مکہ، غزوۂ بدر، غزوۂ حنین وغیرہ کے واقعات کی تفصیل جاننے کے لیے ہمیں کتب سیرت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔اس سے واضح ہوا کہ قرآن پاک کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے سیرت نبوی کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔

۳- قرآن پاک کے اوامر پر عمل اور ان کی تنفیذ کے لیے سیرت کا مطالعہ ضروری ہے: قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا واتقوا الله، ان الله شدید العقاب'' (تمھیں جو کچھ رسول دے اسے لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ سخت عذاب والا ہے)۔ اسی طرح قرآن پاک میں کئی مقامات پر رسول اللہؐ کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''أطیعوا الله والرسول لعلکم ترحمون'' (سورۃ آل عمران: ۱۳۲) (ور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کروتا کہ تم پر رحم کیا جائے۔) دوسری جگہ فرمایا: ''قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله و یغفرلکم ذنوبکم، والله غفور رحیم'' (سورۃ آل عمران: ۳۱) (کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ معاف فرمادے گا، اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔)

ان آیات کریمہ میں واضح طور پر اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول اللہؐ کی اطاعت و فرمانبرداری اور آپ کی پیروی و اتباع کا حکم دیا گیا ہے، اور ان آیات پر عمل اسی وقت ممکن ہے جب کہ رسول اللہؐ کے اقوال وافعال اور آپ کی زندگی کے حالات سے واقفیت حاصل کی جائے اور یہ چیز سیرت نبوی کے مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

مطالعہ سیرت کی اہمیت غیر مسلموں کے لیے: یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہؐ کی بعثت پچھلے انبیاء کرام کی طرح کسی ایک قوم یا ایک علاقہ کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ آپ کو پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ قرآن پاک میں صاف طور پر اس کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ لا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ يُحْيِـي وَيُمِيتُ فَآمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔'' (سورۃ الاعراف: ۱۵۸) (آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر جو کہ اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کا اتباع کرو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔) دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيراً وَنَذِيراً وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُون''۔ (سورہ السبا: ۲۸) (ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ علم نہیں

رکھتے۔)ان آیات کریمہ میں اور دوسری بہت سی آیات میں یہ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ رسول اللہؐ کی بعثت دنیا کے تمام انسانوں کے لیے عام ہے، جب کہ یہ حقیقت ہے کہ پچھلے انبیاء کرام کو کسی خاص امت اور کسی خاص علاقہ کے لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی زمانہ میں دو مختلف علاقوں میں الگ الگ رسول بھیجے گئے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں حضرت لوط علیہ السلام کو بھی رسول بنایا گیا تھا۔قرآن پاک کا یہ واضح اعلان دنیا کے تمام انسانوں کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اس اعلان کی طرف توجہ دیں اور سنجیدگی سے اس پر غور کریں، نیز قرآن کے عالمی ہدایت نامہ ہونے اور رسول اللہؐ کے آخری اور آفاقی ہونے کے دعوے کا جائزہ لیں، اور اگر یہ دعویٰ سچا ثابت ہو جائے تو اس کی تصدیق کریں اور اسے قبول کریں ورنہ انکار کردیں۔ ظاہر ہے کہ اس دعوے کو پرکھنے اور اس کا جائزہ لینے کے لیے انھیں دعویٰ کرنے والے کی زندگی اور اس کے اخلاق و کردار کا جائزہ لینا ہوگا، اور اس کی سیرت کا مطالعہ کرنا ہوگا۔اس سے معلوم ہوا کہ سیرت نبوی کا مطالعہ صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ ان غیر مسلموں کے لیے بھی ضروری ہے جو حق وصداقت کے متلاشی ہیں اور حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے غیر مسلم مستشرقین حضرات نے قرآن پاک اور سیرت نبوی کا مطالعہ گہرائی سے کیا اور ان میں سے بہت سے یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے کہ محمد رسول اللہؐ نے قرآن پاک اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب برپا کیا، اور ایک ایسی امت تیار کردی جس نے اپنے شاندار کارناموں سے جریدۂ عالم پر اپنا نام ہمیشہ کے لیے ثبت کردیا ہے۔

سیرت نبوی کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟

۱- مطالعہ قرآن کے ذریعہ: سیرت نبوی سے واقفیت کا سب سے مستند اور صحیح ترین ذریعہ قرآن پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی بہت سی آیتوں میں اپنے رسولؐ کی سیرت خود بیان فرمائی ہے، اور آپ کی زندگی میں پیش آنے والے بہت سے واقعات کا ذکر کیا ہے، خصوصاً آپ کے اخلاق و کردار کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور ساتھ ہی آپ کے صحابہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ نیز بعض واقعات کی طرف اشارے کیے ہیں جن کی تفصیل ہمیں تفسیر وحدیث اور سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مشہور قول پیچھے گزر چکا ہے: ''کان خلقہ القرآن'' یہاں بطور مثال چند آیات پیش ہیں، جن سے آپ کی سیرت مبارکہ پر روشنی پڑتی ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''و انک لعلی خلق عظیم'' (سورۃ القلم:۴) (یقیناً آپ بہت عظیم اخلاق والے ہیں۔) دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''محمد رسول اللہ و الذین معہ اشداء علی

الکفار رحماء بینهم، تراهم رکعا سجدا یبتغون فضلا من الله و رضوانا سیماهم فی وجوههم من أثر السجود ''(سورۃ الفتح:۲۹)(محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحم دل ہیں، تم انھیں رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے دیکھو گے، وہ اللہ کے فضل اور رضا مندی کی جستجو میں رہتے ہیں، ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ظاہر ہے)

ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''لقد جاء کم رسول من أنفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم، بالمومنین رؤف رحیم''(سورۃ التوبہ:۱۲۸)((لوگو) تمھارے پاس تمھیں میں سے ایک رسول آگیا ہے، جس کو تمھاری مضرت کی چیز نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمھاری بھلائی کا بڑا خواہش مند رہتا ہے، ایمان والوں کے ساتھ بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔)

(۲) کتب تفسیر اور کتب حدیث کے مطالعہ کے ذریعہ: قرآن پاک کے بعد دوسری اہم چیز جو سیرت کے مطالعہ کے لیے اہم مرجع ہے وہ کتب تفسیر ہیں، کیونکہ ان میں ہمیں ان باتوں کی تفصیل وتشریح ملتی ہے جو قرآن پاک میں مجمل ہیں۔ اسی طرح ان واقعات کی تفصیل ملتی ہے جن کی طرف قرآن پاک میں اشارے کیے گئے ہیں۔ تفاسیر میں متقدمین کی تفسیریں زیادہ صحیح اور معتبر ہیں، بعد کی تفاسیر میں بہت سی ضعیف روایات اور اسرائیلیات شامل ہوگئی ہیں۔ معتبر تفاسیر میں ''تفسیر ابن کثیر'' زیادہ اہم مانی جاتی ہے۔ بعد کی تفاسیر میں علامہ شوکانی کی تفسیر ''فتح القدیر'' بہتر ہے جو روایت و درایت کا مجموعہ ہے۔ تفاسیر کے ساتھ کتب حدیث کا مطالعہ بھی سیرت نبوی سے واقفیت کا اہم ذریعہ ہے۔ احادیث کے بہت سے مجموعے ہمارے سامنے ہیں، ان میں ظاہر ہے کہ صحیحین (بخاری و مسلم) نیز مؤطا امام مالکؒ کا مرتبہ سب سے بلند ہے اور ان کی روایتیں صحت کے اعتبار سے سب سے بلند درجہ پر ہیں، ان کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

(۳) کتبِ سیرت کا مطالعہ: سیرت کے موضوع پر بہت زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں جن کے مطالعہ سے بہت تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے سیرت نبوی کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔ صحابہ کرام کے بعد ہی سے سیرت سے متعلق روایات جمع ہونی شروع ہوگئی تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور حکم دیا کہ غزوات نبوی کا خاص حلقہ درس قائم کیا جائے۔ عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری (متوفی ۱۲۱ھ) جو اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے ان کو حکم دیا کہ جامع دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں۔ (تہذیب التہذیب)

سیرت کے اہم مراجع

اسی زمانے میں امام زہری (محمد بن مسلم بن شہاب الزہری) (۵۰ھ-۱۲۴ھ) تابعی نے مغازی پر

ایک مستقل کتاب لکھی اور جیسا کہ امام عبدالرحمٰن سہیلی نے روض الأنف میں تصریح کی ہے: ''یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی۔'' امام زہری اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ فقہ وحدیث میں ان کا کوئی ہم سر نہیں تھا۔ وہ امام بخاری کے استاذ الاساتذہ ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے، جوان، بوڑھا، عورت، مرد جو مل جاتا، یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں سے بھی رسول اللہؐ کے اقوال واحوال پوچھتے اور قلمبند کرتے تھے۔ انھوں نے کتاب المغازی غالبًا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ہدایت کے مطابق لکھی تھی۔ ان کے حلقۂ درس سے ایسے لوگ نکلے جو خاص طور سے اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ ان میں یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح عمار، عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ امام زہری کے تلامذہ میں سے دو افراد نے اس فن میں بہت شہرت حاصل کی۔ موسیٰ بن عقبہ الأسدی اور محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۰ھ)۔ موسیٰ کی کتاب آج موجود نہیں ہے، لیکن سیرت کی قدیم کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں، محمد بن اسحاق بن یسار کی کتاب نے شہرت حاصل کی۔ وہ تابعی تھے اور انھوں نے صحابی حضرت انس بن مالکؓ کو دیکھا تھا، ان کی کتاب کثرت سے پھیلی، اسی کتاب کو ابن ہشام نے نئے سرے سے تنقیح وترتیب اور اضافے کے ساتھ مرتب کیا جو ''سیرت ابن ہشام'' کے نام سے مشہور ہے اور بہت سی جامعات و مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس کے بعد بہت سے لوگوں نے سیرت پر کتابیں لکھی ہیں جو مشہور ومعروف ہیں، انھیں میں سے ایک اہم کتاب ''طبقات ابن سعد'' ہے جو ۱۲ جلدوں میں ہے، اس کی دو جلدیں آں حضرتؐ کے حالات پر خاص ہیں۔ باقی جلدوں میں صحابہ کرامؓ کے حالات ہیں۔ ان کے علاوہ ہر زمانے میں سیرت نبوی پر کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں اور آج بھی لکھی جا رہی ہیں جو مختلف کتب خانوں اور لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ دیگر اہم مراجع میں امام بخاری کی تاریخ صغیر، اور تاریخ کبیر، اور علامہ طبری کی تاریخ کبیر اور امام ابن القیم کی ''زاد المعاد'' ہے۔ موجودہ دور کی مستند کتابوں میں علامہ شبلی نعمانی کی ''سیرت النبی'' اور مولانا محمد سلیمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمین'' بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ''سیرت سرور عالم'' اور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کی ''الرحیق المختوم'' سیرت نبوی کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں گرانقدر اضافہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان تمام لوگوں کی کوششوں کو قبول فرمائے جنھوں نے سیرت نبوی کے موضوع پر تصنیف و تالیف کی اور انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، اور تمام مسلمانوں کو رسول اللہؐ کی سیرت طیبہ کو صحیح طور پر پڑھنے، سمجھنے اور اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو سنوارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین، وصلی اللہ علی خیر خلقه محمد و علی آله و صحبه أجمعین۔

***شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی**

فارغین مدارس کا مطلوبہ کردار

- مدارس اسلامیہ کے قیام کا بنیادی مقصد کیا ہے؟
- سماج میں فارغین مدارس کا کردار کیا ہونا چاہئے؟
- فارغین مدارس کی موجودہ صورتحال کیا ہے، کیا وہ سماج میں مطلوبہ کردار ادا کررہے ہیں؟
- اگر نہیں، تو اس صورتحال کے اسباب کیا ہیں اور اس میں تبدیلی لانے کے لیے کیا عملی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں؟

یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو فارغین مدارس اور سماج میں ان کے مطلوبہ کردار سے متعلق سامنے آتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ان سوالات پر اچھی اور مفید گفتگو کی گئی ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس سے ہمارے درمیان ایک سنجیدہ علمی بحث کا آغاز ہوگا۔ (مدیر)

❶

رضوان احمد فلاحی*

دینی علوم کے تحصیل کنندگان کا منصبی فریضہ کیا ہو اور ان سے معاشرے میں کس قسم کا کردار ادا کرنے کی توقع کی جانی چاہیے اس جانب سورہ توبہ کی آیت 122 / ہماری رہنمائی کرتی ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ مسلم معاشرے کے چھوٹے سے سہی، ایک گروہ کو لازماً دین کا فہم حاصل کر کے دوسروں کو باخبر کرنے کا فریضہ انجام دینا چاہیے تا کہ مؤخر الذکر غیر اسلامی روش سے پرہیز کریں۔ افکار و اعمال کی دنیا میں غیر اسلامی روش سے محفوظ رکھنے کا عظیم فریضہ علوم اسلامی کے حاملین کی ذمہ داری قرار پاتی ہے جس کی ادائیگی میں کوتاہی پر انہیں جواب دہ ہونا پڑے گا۔ یہاں اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ قائدانہ کردار یکساں طور پر ان مرد و خواتین دونوں کو اپنے اپنے دائرے میں بلا تفریق ادا کرنا ہے جنہیں علوم اسلامی میں فہم و ادراک کا وافر حصہ ملا ہو۔ اس قائدانہ کردار کی ادائیگی کے لیے بنیادی طور پر فارغین کی ذات میں تین اساسی عناصر کا اجتماع ناگزیر ہے:

اول: کردار کی صلابت، دوم: فکری پختگی، اور سوم: علمی رسوخ۔

کردار کی صلابت سے مراد یہ ہے کہ قائد نہ صرف عام اخلاقیات پر کھرا اترتا ہو بلکہ کسی چیز کی طرف دوسروں کو دعوت دینے سے پہلے خود اس کا عملی نمونہ پیش کرے اور اس کی زندگی قول و فعل کے تضاد سے پاک ایک کھلی کتاب ہو۔

قائد کی فکری اساس مضبوط ہو۔ اگر دنیائے فکر میں وہ بے یقینی، تشکک یا فکری انتشار کا شکار ہو تو اس کی رہنمائی کبھی مثبت طور پر نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگی۔

رہنمائی کا عمل سطحی یا درمیانہ درجہ کے علم کا نہیں راسخ علم کا طالب ہے۔ یہ بات کسی قدر وضاحت چاہتی ہے۔

محض کسی درس گاہ سے سند کا حصول حامل سند کو از خود رہنمائی کے منصب پر فائز نہیں کر دیتا ہے۔ بلکہ فکری اور علمی سطح پر رہنمائی کا عمل بڑی ریاضت چاہتا ہے۔ برسوں پر محیط فکری و علمی تربیت کی بھٹی سے گزرنے کے بعد ہی ایک عالم دین رہنمائی کے منصب پر متمکن ہونے کا اہل بنتا ہے۔ ایسا شخص جہاں حقیقی رشد و ہدایت کے سرچشموں تک راست رسائی رکھتا ہے اور ان سے براہ راست استفادہ کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا ہے وہیں وہ اپنے اردگرد کی دنیا اور معاصر نظامہائے فکر و عمل سے بھی واقفیت رکھتا ہے، ان کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہوتا ہے اور وحی الٰہی کی روشنی میں انسانیت کے لیے ان کا

غیر نافع ہونا ثابت کرتا ہے۔

قائدانہ کردار ادا کرنے والے گروہ کے لیے جتنا یہ جاننا ضروری ہے کہ 'اسلام کیا ہے'، اسی قدر یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ 'اسلام کیا نہیں ہے' یا کہ 'غیر اسلام' کیا ہے اور دونوں کے مابین عقائد و افکار اور اخلاق و اعمال میں کیا جوہری فرق ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ 'غیر اسلام' پیروان اسلام کے ذہن میں نفوذ حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہا کرتا ہے، نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ دین میں بگاڑ دین کے نام پر ہی آتا ہے۔ اب اگر یہ گروہ اپنی کم نظری اور علمی سطحیت کی وجہ سے ایسے افکار و اعمال کو جن کی جڑیں 'غیر اسلام' میں پیوست ہوں، اسلام سے متصادم نہ سمجھ سکے اور ان کی جانب رہنمائی کرنے لگے تو اسلام کی عمارت ڈھانے کے لیے کسی بیرونی دشمن کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

معاصر دنیا کے چیلنجز سے آگاہی، اس سے اس کی زبان میں اور معاصر اسلوب میں مخاطبت، فکری پختگی کے ساتھ اسلام کے آفاقی پیغام کی ترسیل اور پورے اعتماد اور شعور و آگہی کے ساتھ دنیا کے سامنے واشگاف اعلان کہ صرف آخرت کی کامیابی ہی نہیں، بلکہ خود اس دنیا میں بھی پر امن زندگی گزارنے کی ضمانت صرف اسلام دیتا ہے، اس کردار کے حرکی عناصر ہیں جس کی ادائیگی مدارس کے فارغین سے مطلوب ہے۔

*لندن، برطانیہ، ای میل:rizwanfalahi@hotmail.com

2

محمد اسماعیل فلاحی*

فارغین سے ہماری مراد ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مدارس عربیہ سے ہر سال سند عالمیت و فضیلت لے کر ہزاروں ہزار کی تعداد میں نکلنے والے وہ طلبہ ہیں جو زندگی کے ہنگاموں اور معرکہ خیر و شر میں قدم رکھتے ہیں اور مدارس سے ہماری مراد قرآن و سنت اور ان سے متعلق دوسرے علوم کا منبع اور سرچشمہ وہ ادارے، اور روحانی و معنوی وہ قلعے ہیں جن کی اصل مکہ کا دارِ ارقم اور مدینہ کا صفہ نبوی ہے۔

مدارس کے یہ نئے نئے فارغین اپنے کو عالم سمجھتے ہیں اور دنیا بھی انہیں عالم کہتی اور العلماء ورثة الانبیــــاء کی روشنی میں جانشین انبیاء کی حیثیت سے دیکھتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا مقام بہت اونچا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کا اس اہم منصب کے لیے انتخاب کیا ہے اور وہ انبیاء کی وراثت کے حقدار ہیں، لیکن انہیں سمجھنا چاہیے کہ ابھی بہت سی منزلیں باقی ہیں۔ ابھی تو انھوں نے مدرسہ کے مقررہ نصاب کی تکمیل کرکے، علم کی وادی میں قدم رکھا ہے اور اس سرزمین پر چلنا سیکھا ہے۔ ابھی اس راہ میں انھیں ایک لمبا سفر طے کرنا باقی ہے۔ ابھی ان کے سامنے نہ جانے علم کی کتنی اقلمیں آئیں گی جنھیں سر کرنا ہے۔ اپنے ذہن سے وہ نکال دیں کہ علامہ ہو گئے ہیں، اپنی پوری زندگی اور اپنے پورے وجود کو لگا دینے کے

بعد اس انبیائی وراثت کا کچھ حصہ ہاتھ آتا ہے۔

لیکن اس مرحلہ میں ان سے توقع کی جاتی ہے کہ

(الف) انھیں اس مرحلہ تک پہنچتے پہنچتے عربی زبان وادب کا اتنا فہم حاصل ہوگیا ہوگا کہ قرآن وسنت اور ان کے متعلقات براہِ راست ان کے عربی مآخذ سے سمجھنے پر یک گونہ قادر ہوں گے۔

(ب) حریف کے خیالات اور ان کی چالوں سے واقف ہونے اور ان تک دعوت پہنچانے کے لیے یہ خواہش بھی کی جاتی ہے کہ اپنے علاقہ کی مقامی زبان کے علاوہ کسی ایک عالمی زبان کی اتنی جانکاری ہوگی کہ اس کی بنیاد پر آگے مختلف میدانوں میں کمال پیدا کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔

(ج) یہ امید بھی ان سے بے جا نہیں ہے کہ وقت کے معروف علوم سے ابتدائی واقفیت، حساب اور سائنس کی ضروری بنیادی معلومات، اسلامی تاریخ، اپنے ملک کی تاریخ، دنیا کا جغرافیہ، اپنے ارد گرد کے مذاہب کے ساتھ عالمی مذاہب، اسلام دشمن طاقتوں اور ان کے نظریات، نیز اسلامی تحریکات کے خدوخال کا ایک ایسا سرسری خاکہ ان کے ذہن میں ہوگا کہ آئندہ اپنے حالات کے مطابق جس میدان میں ضرورت ہو، اس میں ماہرانہ صلاحیت اور استادانہ بصیرت پیدا کرسکیں۔

(د) ان سے یہ حسن ظن بھی بجا ہے کہ اپنے افکار وخیالات کو تحریر وتقریر کی شکل میں ادا کرنے کا اچھا سلیقہ رکھتے ہوں۔

یہ تو علمی پہلو تھا، اس کے ساتھ اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے اندر، علیٰ وجہ البصیرۃ، اللہ پر پختہ ایمان ہو اس حیثیت سے کہ تنہا وہی خالق، رازق، مدبرِ کائنات، حاکم حقیقی اور معبودِ برحق ہے، جس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی ہل نہیں سکتا، جس کے ارادے میں کوئی مزاحم نہیں ہوسکتا، جس کے فیصلے کو کوئی بدل نہیں سکتا، جو ایمان والوں سے محبت رکھتا اور ظالموں اور مفسدوں سے نفرت رکھتا ہے۔ اللہ پر یہ ایمان ایسا ہو کہ اللہ کی ذات سے انھیں نہایت گہرا تعلق ہو، ایسا مخلصانہ اور للٰہیت بھرا تعلق، جس کے اندر ریا اور منافقت کا شائبہ تک نہ ہو، وہ اللہ سے سب سے بڑھ کر محبت کرنے والے اور اس کے دین کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے والے ہوں، اللہ کے ذکر کے بغیر انھیں چین نہ آئے، اللہ کی یاد ان کے دل کا سکون بن جائے، نماز ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور بن جائے، سجدے میں اللہ سے قربت کا لطف ملے اور تلاوت قرآن میں اللہ سے ہم کلامی اور سرگوشی سے لذت گیر ہوں۔ ان کا ہر کام اللہ کے لیے ہو، ان کی دوستی و محبت، دشمنی ونفرت، کسی کو دینا اور نہ دینا، ان کی نماز اور قربانی، زندگی اور موت سب کچھ اللہ کی خاطر ہو۔

اللہ سے محبت کے پہلو بہ پہلو، اللہ کا تقویٰ، اس کا ڈر، اس کی خشیت اور اس کا خوف کسی آن اور کسی لمحے بھی ان کے دل ودماغ سے اوجھل نہ ہو۔ یہی تقویٰ انسان کو حدوداللہ کا پاسدار اور احکام الٰہی کا پابند بناتا

ہے، یہی تقویٰ تمام کامیابی کی کلید ہے۔ انسان کی زندگی میں جمال وکمال تقویٰ ہی سے آتا ہے، یہ خلوت میں بھی، جلوت میں بھی، رات کے سنّاٹے میں بھی اور دن کے اجالے میں بھی، دوست کے ساتھ بھی اور دشمن کے ساتھ بھی انسان کو راہِ راست پر قائم رکھتا اور شاہراہِ عدل وقسط سے ہٹنے نہیں دیتا، اسی تقویٰ سے انسان حسد کی آگ اور کبر جیسے مہلک امراض سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے اندر تواضع اور خاکساری پیدا ہوتی ہے۔ تقویٰ چند مظاہر اور مخصوص وضع وہیئت کا ہی نام نہیں، یہ دل کی اس کیفیت کی تعبیر ہے جو خدا کی عظمت وقدرت، اس کی قہاری وجبروت، اس کے بے لاگ عدل اور اس کے محاسب اور مجازی ہونے کے تصور سے پیدا ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں اس کے اندر بے اختیار حلال کو اختیار کرنے اور حرام سے اجتناب کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ اوامر کی پابندی اور مناہی سے احتراز کرنے لگتا ہے۔

اللہ پر ایمان کا تقاضا ہے کہ بلا تفریق اس کے سارے رسولوں اور اس کی ساری کتابوں پر ایمان لایا جائے اور حضرت محمدؐ پر اور قرآن کریم پر دلائل کی روشنی میں اس حیثیت سے ایمان رکھا جائے کہ آپ ساری دنیا اور قیامت تک کے لیے آخری رسول، انسانیت کے سب سے بڑے محسن، اور ہادی ورہبر ہیں، جو سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ اب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور آپ کی لائی ہوئی کتاب قیامت تک کے لیے آخری صحیفۂ ہدایت ہے، جس نے پچھلے تمام صحیفوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ اب نجات کا واحد ذریعہ یہی آخری رسول اور اس کی لائی ہوئی یہی کتاب ہے۔ حضرت محمدؐ پر یہ ایمان، اللہ کے بعد سب سے بڑھ کر محبت کے ساتھ مطلوب ہے، محبت کا تعلق دل سے ہے لیکن اس کا عملی مظہر آپؐ کی اطاعت اور اتباع ہے۔

اسی طرح اللہ کی کتاب کے بارے میں یہ یقین راسخ ہو کہ یہی زندگی کا دستور اور نظام حیات ہے، اس کے علاوہ سارے دساتیر باطل ہیں۔ ہمارے سارے فیصلے خواہ ہماری زندگی سے متعلق ہوں یا دوسروں سے متعلق اس کتاب الٰہی کی روشنی میں ہوں، بنی اسرائیل کی طرح کتاب الٰہی کو ہم پس پشت نہ ڈال دیں۔

اللہ، رسول اور کتاب پر ایمان بے فائدہ اور لاحاصل ہے جب تک آخرت پر ایمان نہ ہو، جہاں ہمیشہ کے لیے جنت کی نعمتیں ہوں گی یا دوزخ کا عذاب اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ پوری بصیرت کے ساتھ خدا کے بے لاگ عدل اور آخرت کی جواب دہی کا احساس ان کے دل ودماغ میں اس طرح رچا بسا ہو کہ خدا کی عدالت میں حاضری کے ڈر سے وہ کانپتے ہوں اور ہر قدم اٹھاتے اور ہر بات بولتے وقت سو بار سوچ لیں کہ اس سے خدا ناراض تو نہیں ہوگا۔

اللہ ورسول اور کتاب پر اگر صحیح معنوں میں ایمان ہے تو لازماً سارے انسانوں سے ہمدردی ہوگی۔ ایسا شخص تمام خلق کو اللہ کا کنبہ، ایک ماں باپ کی اولاد اور اس ناطے آپس میں بھائی بھائی سمجھے گا۔ سب کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی، عدل ومساوات اور سب کی تکریم کا قائل ہوگا۔ اس کا بس ایک ہی پیغام

ہوگا''ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام''۔

اللہ، رسول، کتاب اور آخرت پر ایمان راسخ ہے اور تمام خلق کو اللہ کا کنبہ اور تمام انسانوں کو اولادِ آدم صحیح معنوں میں کوئی سمجھتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے لوگ رنگ، نسل، زبان، علاقہ، مسلک، مشرب اور گروہ بندی کی تنگنائیوں سے نکل کر اور بے جا عصبیتوں سے اوپر اٹھ کر، ایک دوسرے سے محبت اور ایک دوسرے کی تکریم کرنے والے، ایثار پیشہ، عہد کے پابند، زبان کے سچے، امانت دار، دل کے صاف، عفت و حیا کے پیکر، متواضع اور خاکسار، غریبوں، مسکینوں کے مددگار، یتیموں، بیواؤں، مریضوں کے خدمت گزار اور باہم اتحاد و اتفاق اور تعاون کی راہوں کے جویا اور متلاشی، دوسروں کی زیادتیوں کو کشادہ دلی سے معاف کر دینے والے، اپنے حق سے کم پر راضی، اپنی کوتاہیوں کے معترف اور دوسروں کی خوبیوں کے مداح ہوں گے۔ جنھیں ڈالر سے خریدا نہیں جاسکتا اور تشدد اور درندگی سے دبایا نہیں جاسکتا۔ ان کا حال ان لوگوں سے مختلف ہوگا جو دل کے گندے، زبان کے بدبودار، قلم کے متعفن، منافقت، ریاکاری، حسد، تکبر، جھوٹ، غیبت، چغل خوری، لگائی بجھائی اور معاصرانہ چشمک کے گندے نالوں میں لت پت، مسلکی، گروہی، قومی تعصب میں گرفتار، عہد شکن، بددیانت، غدار، سیاسی جوڑ توڑ کرنے والے، موقع ملے تو اسمبلی اور پارلیامنٹ کی ایک سیٹ اور وزارت کی ایک کرسی کے لیے قوم کا سودا کرنے والے، بکاؤ مال، ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے والے، ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے والے، اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کرکے، قوم کے معصوم بچوں کو بھڑکا کر، ان کے اندر اشتعال پیدا کرکے، سڑکوں پر اتار کر، اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے، ان کی زندگیوں سے کھیل جانے والے اور اپنے مفاد کے لیے مختلف طبقات کے درمیان منافرت پیدا کرنے والے اور اپنے بیرونی آقاؤں کے اشارے پر خود اپنی ملت کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے والے ہوتے ہیں۔

آخری اور سب سے اہم بات جو مدرسہ کی تعلیم کا اصل مقصود اور نتیجہ ہے کہ ان فارغین کے سامنے ان کی زندگی کا نصب العین بالکل واضح اور متعین ہو۔ نصب العین نام ہے اس چیز کا جو زندگی کا مقصود ہو، جو ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے۔ ایک لمحہ کے لیے نہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو اور نہ نگاہ اس سے ہٹے۔ جس پر زندگی قربان کی جاسکتی ہو، لیکن زندگی پر اسے قربان نہ کیا جاسکتا ہو۔ اس نصب العین کی مختلف تعبیرات ہوسکتی ہیں۔ اقتدار، اللہ کی بندگی، اللہ کے دین کی اقامت، اللہ کے دین کی سربلندی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اعتصام بحبل اللہ، نماز کی اقامت وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہیں وہ توقعات جو فارغین مدارس سے مطلوب ہیں لیکن بحالت موجودہ، عام طور سے یہ پوری ہوتی نظر نہیں آتیں اور نہ پورا ہونا ممکن نظر آرہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ بڑا مشکل سوال ہے۔ ہمارے پورے نظام تعلیم و تربیت کو گھن لگ چکا ہے۔ ع

سبق شاہیں بچوں کو سکھا رہے ہیں خاک بازی کا

ہر سطح پر (انتظامیہ، اساتذہ، ذمہ داران تربیت، طلبہ اور ان کے سرپرست، نظام تعلیم، نصاب تعلیم، طرز تدریس، نظام تربیت) ہر پہلو اور ہر زاویہ سے بڑی اصلاح اور بڑے آپریشن کی ضرورت ہے، لیکن یہ کون کرے؟ کس کے بس کی بات ہے؟!

* شیخ التفسیر، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی

❸

ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی*

ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا وجود و بقا اور ترقی واستحکام بلا شبہ اسلام اور اسلامی تہذیب کے فروغ واستحکام سے عبارت ہے۔ مدارس کی معنویت وافادیت ملک کو سنجیدہ، باوقار، امن پسند، محبّ وطن اور خادم انسانیت شہری فراہم کرنے کے پہلو سے بھی بہت اہم ہے۔ منضبط ومنظّم زندگی گزارنے، قانون کا احترام کرنے، انسانوں کے حقوق ادا کرنے اور ایک متمدن اور ترقی یافتہ معاشرہ کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کرنے کے لیے مسلم معاشرہ کو تیار یہی مدارس کرتے ہیں۔ خیر سگالی، بقائے باہم، تحمل ورواداری، اور کثرت میں وحدت کے زریں اصول ان مدارس سے ہی تشکیل پاتے ہیں۔ مدارس کی یہ خدمات ہندوستان جیسے تکثیری معاشرے میں اظہر من الشمس ہیں۔

ایک پہلو جو باعث تشویش بھی ہے اور فکر انگیز بھی، وہ علم وتحقیق کے میدان میں مدارس کے فارغین کی نمائندگی کا گھٹتا ہوا تناسب ہے۔ اعلی درجہ کی تحقیقی کاوشیں فضلائے مدارس کی جانب سے ناپید ہوئی جارہی ہیں، یہاں تک کہ عربی زبان وادب اور علوم اسلامیہ، جو مدارس اسلامیہ کی اختصاصی جولان گاہ ہیں، اس تحقیقی عمل سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ مدارس کے فضلاء میں خال خال ارباب تحقیق ملتے ہیں۔ عربی زبان وادب کی مشرق وسطی میں ملازمتوں کے نئے امکانات پیدا ہوجانے سے مانگ بڑھی ہے اور فضلائے مدارس کی معاشی ناہمواریاں کچھ کم ہوئی ہیں، مگر اس میدان میں بھی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بعد سناٹا چھا گیا۔ علوم القرآن، علوم الحدیث، علوم الفقہ، علوم الکلام، علوم تصوف اور دوسرے میدان مدتوں سے کسی حمید الدین فراہیؒ، انور شاہ کشمیری، مناظر احسن گیلانی اور عبدالباری ندویؒ کے منتظر ہیں۔ کوئی کوہ کن آئے اور جوئے شیر وتیشہ وسنگ گراں کو گلے لگائے اور علم وتحقیق سے عشق اور والہانہ وابستگی کے تقاضوں کی تکمیل کرے۔

راقم کی تشویش اور اضطراب کے اس اظہار سے یہ مطلب نکالنا درست نہ ہوگا کہ فضلائے مدارس میں ارباب علم وتحقیق عنقا ہیں۔ بلاشبہ بڑے مدارس کے فارغین کی خدمات پر ایک نظر ڈالی جائے تو کچھ

ایسے محققین نظر آتے ہیں جو سیم وزر کی ترغیبات اور ''فکر معاش وعشق بتاں اور یاد رفتگاں'' کے شکووں سے بلند ہوکر علم کی کوہ کنی میں مصروف ہیں۔ منتسبین دیوبند میں مفتی ظفیر الدین مفتاحی، مولانا بدرالحسن قاسمی اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، فضلائے مظاہر العلوم سہارنپور میں مولانا تقی الدین ندوی مظاہری، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے افاضل میں پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی اور مولانا محمد اکرم ندوی، جامعہ دارالسلام عمرآباد کے فارغین میں مولانا سید جلال الدین عمری اور مولانا ثناء اللہ عمری، مدرسۃ الاصلاح کے علماء اور دانشوروں میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، اور مولانا سلطان احمد اصلاحی، ابنائے جامعۃ الفلاح میں پروفیسر سید خالد حامدی فلاحی، پروفیسر اشتیاق دانش اور ڈاکٹر محی الدین غازی بطور مشتے نمونہ از خروارے وہ شخصیات ہیں جو علم وتحقیق کے گیسو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اور افراد بھی ہیں جن کا نام اس فہرست میں شامل ہوسکتا ہے، مگر عمومی صورتحال اطمینان بخش نہیں ہے۔

فضلائے مدارس میں علم وتحقیق کی کمیابی کے اسباب داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ داخلی اسباب میں سرفہرست مدارس کے اندر علمی ماحول کی عدم موجودگی ہے۔ لائبریری کلچر کا عام طور پر فقدان ہے۔ زیادہ سے زیادہ تدریسی مصروفیات کی ہماہمی ہوتی ہے اور بس۔ نصاب تعلیم سے ماورا مطالعہ کا رجحان عنقا ہے۔ اساتذہ کا زیادہ وقت تدریس وتعلیم کی الجھنوں کو سلجھانے میں صرف ہوجاتا ہے۔

اس پر مستزاد طلبہ اور اساتذہ دونوں کے اندر جفاکشی اور ریاضت سے فرار کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ سہولت پسندی ان کی فطرت کا حصہ بنتی جارہی ہے۔ علم وتحقیق کے لیے مرغوبات دنیا سے ایک حد تک گریز، شہرت ومقبولیت سے کنارہ کشی اور ایک مسلسل ''علمی اعتکاف'' کی ضرورت ہوتی ہے جس کے تقاضے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ محنت وریاضت بتدریج کم ہوتی جارہی ہے۔

مدارس میں شکایات وحکایات کا عمومی مزاج بھی ایک بڑی رکاوٹ ہے علم وتحقیق کی راہ میں۔ انتظامیہ کے خلاف شکوہ عام روایت ہے مگر اب خود اساتذہ کے اندر مختلف مصلحتوں کی رعایت سے گروہ بندی ہورہی ہے اور فارغ اوقات ان ہی شکوہ شکایتوں کی نذر ہورہے ہیں۔ یہ گروہ بندی بسا اوقات مدارس کی چہار دیواری سے نکل کر ابنائے قدیم کو بھی تضییع اوقات پر آمادہ کردیتی ہے اور اس طرح عموم بلوی کی صورت حال بن جاتی ہے۔

مدارس اسلامیہ کی انتظامیہ/شوری کی وقتی ترجیحات بھی تحقیق کی راہ میں سد باب بن جاتی ہیں۔ انہیں مدرسہ کے بجٹ کی فکر زیادہ رہتی ہے، تعلیم وتربیت کی کم، اور علم وتحقیق کی تو بالکل نہیں۔ بسا اوقات ان کی دلچسپیاں اور منصوبہ بندیاں مزاحم ثابت ہوتی ہیں۔

علم وتحقیق کی کمیابی کے خارجی اسباب میں دعوتی اور اصلاحی منصوبوں کی ترجیحات کی نافہمی اہم ہے۔ عام طور پر امام مسجد، مدرس مکتب و مدرسہ، مبلغ وخطیب اور قاضی پیدا کرنے پر اتنا زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اسے دعوت واصلاح کی شاہ کلید اس طرح گردانا جاتا ہے کہ علم وتحقیق کے تقاضے پس پشت چلے جاتے ہیں۔

فضلائے مدارس پر حصول معاش کا فوری اور ہنگامی دباؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ وہ معمول کی مصروفیات ومسائل سے اوپر نہیں اٹھ پاتے۔ مدرسہ سے فراغت کے معاً بعد والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے اور ان کا معاشی دباؤ کچھ کم ہو۔ ان حالات میں ذہین وفطین اور محنتی طلبہ بھی آگے بڑھنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ابنائے مدارس کے لیے وسائل کی قلت بلکہ نایابی ایک بڑی وجہ ہے علم وتحقیق سے ان کی دوری کی۔ ہندوستان میں بعض ایسے ادارے وجود میں آچکے ہیں جو فضلائے مدارس کی علمی وتحقیقی تربیت کا اہتمام کرتے ہیں، جیسے ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ یا حیدرآباد کا المعہد العالی وغیرہ، تاہم ان اداروں کے پاس علمی وتحقیقی منصوبہ بندی کا کوئی وژن نہیں ہے اور اس سے اہم تر بات یہ ہے کہ ان اداروں سے تربیت پا کر نکلنے والے طلبہ کی مارکیٹنگ، ان کے فنی، علمی اور تحقیقی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت اور منصوبہ بندی نہیں ہے، چنانچہ ان طلبہ کی اکثریت کسی مشنری اسپرٹ سے محروم ہوتی ہے اور وہ تربیت پانے کے بعد پھر بھیڑ میں گم ہو جاتی ہے۔

علم وتحقیق کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ فکری ونظری اختلاف کو برداشت نہ کرنے کا عمومی مزاج ہے۔ پورا ملک اس مزاج کی لپیٹ میں ہے مگر عقیدۂ توحید کا دم بھرنے والوں کے لیے یہ خودکشی کے مترادف ہے۔ تحقیق ہمیشہ آگے بڑھتی ہے اختلاف کی وجہ سے۔ اگر فکری اختلاف کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے اس کی ہمت شکنی کی جائے اور اس پر تفسیق وتکفیر کی نوبت آجائے تو علم وتحقیق کا دروازہ اسی لمحہ بند ہو جاتا ہے۔ اجتہاد کو قانون کا ایک اہم ماٗخذ تصور کرنے والے علماء کو اس پہلو پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ان تمام رکاوٹوں کو لانگ کر جو فضلاء اور اہل علم تحقیقی منصوبوں کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں وہ ہماری تحسین وتبریک، تعاون اور دعاؤں کے مستحق ہیں۔ انہوں نے تمام نامساعد حالات کے باوصف فرض کفایہ ادا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور وہ ملت کی خصوصی توجہ کے بلاشبہ حقدار ہیں۔

جامعۃ الفلاح جیسے ادارے جو احیائے اسلام کی عالمی مہم میں اپنا حصہ ادا کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور خدا کی توفیق اور اپنی صلاحیت کے بقدر کردار ادا کر رہے ہیں، ان تحریروں کے خصوصی مخاطب ہیں۔ ابنائے فلاح کی علمی وتحقیقی تگ وتاز کے موضوعات کو آج کی معاصر دنیا کے مسائل سے ہم آہنگ اور

مربوط ہونا چاہیے۔ آج مسلم دنیا کو اکیسویں صدی میں ایک نئے وژن کی ضرورت ہے جو تکثیری معاشرے کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ سماجی تبدیلی کے اصول وضوابط، شرکت اقتدار کی اسلامی منصوبہ بندی، انسانیت کو عدل ومساوات سے ہم کنار کرنے اور آخرت میں نجات حاصل کرنے کے لیے ایک نئے فریم ورک کی فراہمی، غیر مسلم دنیا سے عادلانہ ومساویانہ تعامل وغیرہ بے شمار موضوعات ہیں جن پر تحقیق کرنے کی فوری ضرورت ہے اور یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں قرآن وسنت کا درک اور معاصر حالات سے آگہی ہو، فهل من مجیب؟

* شعبہ اسلامیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ای میل: drfahadamu@yahoo.com

4

شمشاد حسین فلاحی*

دینی مدارس بذات خود وہ مقام ہیں جہاں دین کے حقیقی فہم اور مزاج شناسی کا حصول ہوسکتا ہے۔ مگر حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ اکثر دینی مدارس بنیادی مصادر قرآن وحدیث، سیرت رسولؐ و تاریخ اسلام کے عمیق علم وفہم کے بجائے محض مخصوص مسلک کے چند فقہی مسائل اور اپنے مسلک کی بنیادی معلومات فراہم کر کے اپنے فارغین کو میدان میں اتار دیتے ہیں، جو تبلیغ اسلام کے بجائے تبلیغ مسلک اور تفہیم دین کے بجائے تفہیم مسائل کے ساتھ باہمی اتحاد سے زیادہ اختلاف کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اس کے لیے فارغین مدارس سے زیادہ خود مدارس ذمہ دار ہیں، جو دین کے ناقص تصور کی تفہیم وتدریس 'فرماتے' ہیں، مسالک کی وکالت سکھاتے اور اس کے لیے کمزور مگر متشدد استدلال ومناظرے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ اس سے امت میں زمینی سطح پر افتراق پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''دینی مدارس کے فارغین کے مطلوبہ کردار' ' پر بحث سے زیادہ اہم موضوع بحث ''دینی مدارس کا مطلوبہ کردار'' ہے۔ اس لیے کہ تعلیمی ادارے افراد سازی کے سانچے ہیں۔ ان سانچوں کو درست کیے بنا درست چیز کا حصول ناممکن ہے۔

تاہم اگر فارغین مدارس کے مطلوبہ کردار پر ہی بحث کرنی ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ برصغیر کے مسلمان فارغینِ دینی مدارس کو معتبر عالم دین کی حیثیت سے دیکھتی ہے، اس لیے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے لیے وسیع علم دین، شریعت اور مزاج شریعت کا گہرا فہم اور شریعت اسلامیہ کو حالات حاضرہ کے تناظر میں قابل عمل اور قابل انطباق چیز بنا کر پیش کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب فارغین مدارس اسلام کو ''چند فقہی مسائل کے مجموعے'' کے بجائے ایک ایسے نظام زندگی کی حیثیت سے دیکھیں جو زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ اگر فارغین

مدارس اسلام کو ''شریعت'' اور ''نظام زندگی'' کی حیثیت سے دیکھنے لگیں تو ان کا رول اور کردار ہمہ گیر ہوجائے گا، اور وہ مساجد کی امامت سے لے کر سیاست کے ایوانوں تک میں امت کی قیادت کے اہل ہوجائیں گے۔ معاشی اور سماجی مسائل میں ان کی رائے قابل توجہ اور قابل عمل ہوجائے گی، اور مقامی مساجد سے جو کہ مسلم سماج کی سب سے چھوٹی مگر بنیادی یونٹ ہیں، اتحاد و یکجہتی اور اسلام فہمی واس پر عمل آوری کی ایسی شروعات ہوگی جو پورے سماج کو باقی دنیا کے لیے نمونہ بنادے گی، اور ملت کی ذلت وخواری اور کس مپرسی ہوا ہوجائے گی۔

*ایڈیٹر ماہنامہ حجاب اسلامی، نئی دہلی۔ ای میل: arbtrans@gmail.com

❺

ڈاکٹر محی الدین غازی*

ذریعہ معاش کچھ بھی ہو، اور وقتی مشاغل کسی بھی نوعیت کے ہوں، تاہم فارغین مدارس کا اصل مطلوبہ کردار دینی رہنمائی ہے، دینی رہنمائی کا مطلب صرف دینی رسالوں میں تذکیری نوعیت کے مضامین لکھنا، دینی اجتماعات میں تقریریں کرنا، اور درس قرآن اور درس حدیث کے حلقے قائم کرنا، جمعہ کے دن عربی کا خطبہ پڑھنے سے پہلے اردو میں تقریر کرنا نہیں ہے۔

دینی رہنمائی کا مطلب زندگی کے ہر گوشے سے متعلق دین کی رہنمائی کو پہونچانا ہے خواہ اس کے لئے ذرائع ابلاغ کچھ بھی اختیار کئے جائیں۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے ماہر کے سامنے کوئی ایک شعبہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے سامنے زندگی کے بہت سارے میدان ہوتے ہیں جہاں اسے اپنی مہارت کا ثبوت دینا ہوتا ہے، اس کی ضرورت ہر اس جگہ ہوتی ہے جہاں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا استعمال ہوتا ہے۔ جو کمپنی جس قدر بڑی ہوتی ہے اسے انفارمیشن ٹکنالوجی کے ماہرین کی اسی قدر زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ فارغین مدارس کا دائرہ عمل اس سے بہت زیادہ وسیع ہے، زندگی کے ہر ہر گوشے میں دین کی رہنمائی کو پہونچانا ان کا کام ہے۔ فارغین مدارس کو اپنے کردار کا شعور ہو اور امت کے سارے اداروں کو ان کے کردار کی ضرورت کا احساس ہو، یہ ضروری ہے۔ تب ہی وہ خلا پر ہوسکتا ہے جو دینی رہنمائی کے تعلق سے امت کے ہر ادارے میں پایا جاتا ہے۔

اسلامی مالیاتی اداروں کی جب ابتدا ہو رہی تھی تب ہی یہ طے ہوگیا تھا کہ ہر اسلامی مالیاتی ادارے کی نگرانی اور رہنمائی کے لئے ماہرین شریعت کا ایک بورڈ ہوگا، خواہ وہ مالیاتی ادارہ کوئی اسلامی بینک ہو، یا اسلامی انشورنس کمپنی ہو یا کوئی فنڈ ہو۔ نگرانی یا رہنمائی کا یہ کام کس قدر ہوسکا یہ تفصیل طلب موضوع ہے۔

تاہم ماہرین شریعت کی نگرانی اور رہنمائی صرف مالیاتی اداروں کی ضرورت کیوں قرار دی جائے، سماجی خدمت کے ادارے یا سیاسی عمل میں مصروف جماعتیں یا دیگر تجارتی کمپنیاں اور صنعتی منصوبے

ماہرین شریعت کی رہنمائی کو اپنے لئے ضروری کیوں نہ سمجھیں۔ دینی تنظیمیں اور تحریکات اپنی پالیسی بناتے وقت یا اہم فیصلے لیتے وقت ماہرین شریعت سے فتوی لینے کی ضرورت کیوں محسوس نہ کریں۔

لیکن امت کے اداروں سے یہ شکایت کرنے کے بجائے کہ وہ ماہرین شریعت کی خدمات سے بے نیازی کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں، فارغین مدارس کو یہ جائزہ لینا ہوگا کہ وہ کس قدر ماہر شریعت بن سکے ہیں، شریعت کے مآخذ پر ان کی کس قدر ماہرانہ نظر ہے، اور زندگی کے جن گوشوں میں شریعت کی رہنمائی پیش کرنا ہے ان گوشوں سے کس قدر واقفیت ہے۔ اگر فارغین مدارس دینی رہنمائی کا اہل خود کو ثابت نہ کرسکے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جدید تعلیم یافتہ اہل دانش زندگی کے اہم مسائل پر گفتگو کرنے سے پہلے کسی فارغ مدرسہ کی خوش الحان تلاوت اور روح پرور تذکیر کو مجلس کی آرائش کے لئے ضروری اور کافی سمجھیں۔

مدارس کے اساتذہ اور منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو اس کردار کے لئے تیار کریں یا کم از کم اس کردار کی ادائیگی کا شوق پیدا کریں، کسی بھی مدرسہ کی کامیابی کی علامت وہاں کی عظیم الشان عمارتیں، طلبہ کی بڑی تعداد، اور اساتذہ کا اعلی علمی مقام نہیں ہوتے، بلکہ یہ کہ مدرسہ کے فارغین میں ماہرین شریعت کا تناسب کتنا ہے، اور دینی رہنمائی کا کام انجام دینے والے کتنے ہیں۔

یہ درست ہے کہ آج بھی امت کے بہت سارے ادارے اور تنظیمیں علماء کی قیادت ونظامت کے تحت ہیں، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہ قیادت ونظامت کس قدر اطمینان بخش اور قابل اعتماد ہے، اور غیر علماء کی قیادت ونظامت سے کس قدر مختلف اور ممتاز ہے۔ بدلو کہ زمانے کو بدلنا ہے تمہیں۔

*ہیڈ آف ریسرچ دار الشریعہ، متحدہ عرب امارات، ای میل:

mohiuddin.ghazi@gmail.com

❻

محمد الیاس خان فلاحی*

مدارس بلاشبہ اسلام کے قلعے ہیں۔ ارباب مدارس وفارغین کی غیر معمولی کاوشوں نے فروغ اسلام اور اسلامی معاشرے کی آبیاری میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ بھارت میں مسلم مملکتوں کے زوال کے بعد اور عالمی سطح پر سقوط خلافت کے بعد مدارس اور تحرکات اسلامی نے تجدید واحیاء دین کے لئے تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود فارغین مدارس سے جو توقعات اور امیدیں ملت اسلامیہ کے دردمند طبقہ کو ہیں وہ شاید شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں۔ ان مدارس کے درمیان جامعہ کی شناخت ایک انقلابی دور کے آغاز کے طور پر ہونی چاہیے تھی۔ آج ہمیں پوری دیانتداری سے اپنے آپ کا جائزہ و احتساب لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم دین کی اقامت، ملت کی شیرازہ بندی اور نشأۃ ثانیہ (

Revival) کے لئے سنجیدہ ویکسو ہیں؟ ملت اسلامیہ کے پس منظر میں اگر ہم اس کا جائزہ لیں تو ہمارے سامنے یہ صورتحال آتی ہے:

۱۔ مدارس کے فارغین کی اکثریت مادّی منفعتوں کے حصول میں توازن واعتدال کا دامن چھوڑ کر سرگرداں ہیں۔ وہ اپنی بنیادی شناخت تک کوفراموش کر چکے ہیں۔ مادی علوم کا حصول اور تجارتی ومعاشی سرگرمیاں بجائے خود غلط نہیں ہیں لیکن یہی چیزیں اگر وراثین انبیاء کی سعی وجہد کا محور و مدار بن جائیں تو یہ بڑی اندوہناک کیفیت ہوگی۔ بزبان شاعر اسلام

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

۲۔ اسلام کو آج ایسے دُعاۃ اور ترجمانوں کی ضرورت ہے جو ہدایت سے محروم انسانیت کو اسلام کے چشمہ صافی سے سیراب کرسکیں۔ مغربی تہذیب اپنی تمام ترفتنہ سامانیوں کے ساتھ انسانی دنیا میں ایک ناکام ونامراد تہذیب وکلچر کی حیثیت سے تاریخ کا حصہ بن رہی ہے۔ خودساختہ مذاہب اور نظریاتِ باطلہ دم توڑ رہے ہیں انسان اباحیت پسندی اور نفس پرستی کے دلدل میں پھنستا چلا جارہا ہے۔ لیکن افسوس ہم اسلام کو متبادل نظام حیات کی حیثیت سے پیش کرنے کے سلسلہ میں سنجیدہ کردار ادانہیں کر پارہے ہیں۔ آج تحریکات اسلامی کے مبلغین کی اکثریت اور نامور اسلامی مبلغین کسی مدرسے کے فارغ نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ فارغین جامعہ دعوت وتبلیغ کے میدان میں انقلابی جدوجہد کا آغاز کریں۔

۳۔ ملت اسلامیہ کے زوال وانحطاط کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب خودفراموشی اور اپنی شناخت وحیثیت کو بھول جانا بھی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امت تشخص کے بحران سے گزررہی ہے۔ خوداعتمادی دم توڑتی جارہی ہے۔ عالمی وملکی سطح پر یاس وقنوطیت کے بادل چھارہے ہیں۔ امت کی صفوں میں انتشار و بکھراؤ کا منظر ہے۔ مسلکی اختلافات اور جماعتی عصبیتیں عروج پر ہیں، ایسے حالات میں فارغین جامعہ سے بجاطور پر توقع ہے کہ وہ امت کا سہارا بنیں، اور چمن اسلام کی اپنے خون جگر سے آبیاری کریں۔

۴۔ مساجد ومکاتب: مساجد ومکاتب یہ امت کے عظیم دینی محاذ ہیں۔ مساجد کی اہمیت وکردار ہر صاحب بصیرت پر واضح ہے۔ امت کے سواد اعظم کا دل آج بھی مساجد کے تقدس سے معمور ہے لیکن افسوس اس کے منبر ومحراب ہمارے فارغین کے منتظر ہیں۔ ان مساجد کو اصلاح وتربیت اور دعوت وتبلیغ کا مرکز بنانا ہمارے مشن کا حصہ ہونا چاہیے۔ اور یہ مکاتب دینیہ جہاں سے ملت کے معصوم بچے اسلام کے مبادی و اساسیات کا علم حاصل کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کو اپنے دل ودماغ کا حصہ بناتے ہیں۔ وہاں بھی ہمارے فارغین نظر نہیں آتے۔ ان دونوں محاذوں پر ہمیں اپنے واقعی کردار کو ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۔تحریک اسلامی: برصغیر میں تحریک اسلامی اسلام کی منظّم وطاقتور آواز بن کرا ابھر رہی ہے، اور مختلف میدانوں میں اقامت دین کے لئے برسرعمل ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کا ہراول دستہ ہمارے فارغین سے روشن ومعمور ہوتا لیکن ہزاروں میں سے معدودے چند ہی ہیں جو تحریک کی صفوں میں قربانیاں دے رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنی علمی وفنی صلاحیتوں سے تحریک کے لئے قوت وشوکت کا ذریعہ ثابت ہوں اور اپنی دینی بصیرت اور تفقہ فی الدین سے دینی اور مذہبی پیشوائی کا حق ادا کریں۔

۶۔اجتہاد وعلمی کاوشیں: فارغین جامعہ کی دینی علوم میں اجتہادی مقام تک رسائی ہونی چاہیے اور تمام علمی محاذوں پر طاری جمود وتعطل کو ختم کرتے ہوئے پیش آمدہ مسائل میں اسلام کی تعلیمات سے امت مسلمہ اور انسانی دنیا کو فیض پہنچانا چاہیے۔

ہم فارغین جامعہ کے لئے صفہ کی نبوی درسگاہ اور اس کے مقدس فارغین مینارۂ نور ہیں اور ہم اپنے دل پذیر ترانہ میں اسے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔

اہل صفہ کی طرح ہم بھی برومند ہوئے
ہم ہیں پروانے تیرے شمع ضیابار فلاح

شاید شاعر اسلام کا یہ انقلاب آفریں پیغام ہمیں خواب غفلت سے بیدار کردے:

چشمِ اقوام پہ مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانہ کو حرارت تیری
کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری

* معاون سکریٹری جماعت اسلامی ہند، حلقہ مہاراشٹر، ای میل: mdilyasf@gmail.com

7

اشتیاق عالم فلاحی*

مدارس اور فارغین مدارس کی ایک طویل تاریخ رہی ہے۔ مدارس نے ملت کی شیرازہ بندی میں اہم کردار ادا کیا ہے اور فارغین مدارس نے کارناموں کے اہم ابواب رقم کیے ہیں۔ پر اب نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ فارغین کا مطلوبہ کردار کیا ہو اس پر گفتگو کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

ہر فرد اللہ کے یہاں جواب دہ ہے۔ بطور خاص جسے جس قدر نعمت ملی اس کی جواب دہی اسی کے مطابق ہوگی۔ فارغین مدارس کو اللہ تعالیٰ نے جو دولت دی ہے اس کا احساس ہی کردار ادا کرنے کا پہلا مرحلہ ہے۔ انسانوں کے ایک بڑے سماج میں مختلف لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی مختلف عنایات ہوتی ہیں۔ کچھ

لوگوں پر اللہ تعالیٰ اتنا مہربان ہوتا ہے کہ انہیں اپنے دین کا علم حاصل کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔عربی زبان قرآن کی زبان ہے۔اللہ کی پسندیدہ اور منتخب زبان ہے۔اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وہ عربی زبان کا علم حاصل کرتا ہے۔اس زبان کی مدد سے راست اللہ کی کتاب سے استفادہ کا اسے موقع ملتا ہے۔اللہ کی کتاب لانے والے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین سے واقفیت کے مواقع نصیب ہوتے ہیں۔اس علم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم کے نام پر پھیلی ہوئی بے شمار چیزوں کے درمیان وہ بصیرت کی نگاہ استعمال کرتے ہوئے کھرے اور کھوٹے میں تمیز کی صلاحیت رکھتا ہے۔رب کا کیا فرمان ہے؟ رسول کی کیا تعلیم ہے؟ میرا رب کس بات کو پسند کرتا ہے؟ اس کی ناراضی کس بات میں ہے؟ زندگی کو صحیح ڈگر پر رکھنے کے لیے ان سوالات کا صحیح جواب بہت ضروری ہے۔اللہ کی تعلیم اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے راست استفادہ کی صلاحیت کوئی معمولی دولت نہیں۔اس کا اندازہ ان لوگوں کے تأثرات سے کیا جاسکتا ہے جنہیں یہ دولت نہیں ملی۔

اس دولت کا تقاضا ہے کہ فارغین مدارس کی زندگیاں اور ان کا عمل قرآن وسنت کی خوشبو سے معمور ہو۔عمل تو کردار ہی کا حصہ ہوتا ہے۔دوسری طرف وہ سماج جو اللہ کی اس نعمت سے محروم ہے اس کی رہنمائی کی ذمہ داری بھی ہے۔جس کے پاس حقیقی علم ہے رہنمائی کا منصب بھی اسی کے لیے ہے۔اس منصب بلکہ ذمہ داری سے غفلت سے ہمیں ناکامی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔

سماج کی دینی رہنمائی کوئی معمولی منصب نہیں ہے۔یہی فارغین مدارس اور صحیح لفظوں میں علماء کا امتیازی کردار ہے۔دینی رہنمائی، اپنے وسیع معنوں میں، سماج کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔یہ سماج کو مثالی قرآنی سماج بنانے کی کوشش ہے۔اس فرض کو ادا کرنے والے کے سامنے ہمیشہ عہد نبوی کا مثالی معاشرہ ہوتا ہے۔اس ذمہ داری کے لیے ضروری نہیں کہ فرد ہمہ وقتی طور پر فارغ ہو۔ہر مصروفیت سے الگ ہو کر اسی مقصد کے لیے اپنی صبح وشام کو فارغ بھی کیا جاسکتا ہے اور کارزار حیات میں مصروف رہ کر بھی اس مقصد سے مخلصانہ وابستگی کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔زندگی کے حقائق کا سامنا کرتے ہوئے اس فرض کو نبھانا بھی تو ایک کمال ہے۔معاشی سرگرمیاں، تجارت، ملازمت، تدریس اور دیگر سماجی مصروفیات کے باوجود دینی رہنمائی کا فرض ادا کرتے رہنا علم دین سے وابستگی کا تقاضا ہے۔جس کردار میں اس تقاضے کو پورا کرنے کا جوش، پاسِ امانت اور جذبۂ صادق ہو وہی علم دین کی نمائندگی کا حقدار ہے۔میرے خیال میں فارغین مدارس کا مطلوبہ کردار یہی ہے کہ سماج کو مثالی قرآنی سماج بنانے کی جدوجہد میں وہ قائدانہ کردار ادا کریں، دینی رہنمائی کا کام کریں۔

* دوحہ، قطر، ای میل: i_falahi@yahoo.com

❽

دانش ریاض فلاحی*

ممبئی میں اسلام جمخانہ کا استعمال کمیونٹی سینٹر کے طور پر ہوتا ہے۔ملک وملت کو درپیش مسائل پر اگر یہاں سیمینار،سمپوزیم،مباحثہ یا پھر اجلاس کا انعقاد کیا جاتا ہے تو قوم وملت کے افراد اپنی مختلف طرح کی پارٹیاں بھی یہیں منعقد کرتے ہیں۔منتظمین نے لوگوں کی سہولت کے لئے ایک کمرے کو مسجد کے لئے مختص کر دیا ہے جہاں پنجوقتہ نماز ادا کی جاتی ہے۔چونکہ امامت اب ملازمت کے زمرے میں شامل ہوگئی ہے لہٰذا ایک عدد پیش امام کا بھی انتظام ہے۔رمضان المبارک میں ہم دوستوں نے بھی اپنی افطار پارٹی وہیں رکھی۔چونکہ ہمارے چند احباب افطار پارٹی کے منتظمین میں شامل تھے لہذا وہ مغرب سے بہت قبل ہی وہاں پہنچ چکے تھے،دوستوں میں ایک صاحب کی نماز عصر باقی تھی لہذا وہ اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ مذکورہ مسجد میں چلے گئے۔باپ بیٹا جیسے ہی وضو کر کے مسجد میں داخل ہوئے۔تلاوت قرآن میں مشغول پیش امام صاحب کی پیشانی پہ بل آ گیا اور بڑے ہی کرخت الفاظ میں انہوں نے بچے کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ''ہاف پینٹ پہن کر مسجد میں داخل ہوتے ہوئے شرم نہیں آتی''۔وہاں موجود بچے کے والد نے فوری طور پر مداخلت کی اور جواب دیا کہ چونکہ میرا بیٹا اسکول سے فوری طور پر یہاں چلا آیا ہے لہذا اسے کپڑے تبدیل کرنے کا موقع نہیں ملا،لیکن پیش امام صاحب نے اسے عذر لنگ شمار کرتے ہوئے دوبارہ کڑکدار آواز میں کہا کہ''جب کپڑے تبدیل نہیں کرا سکے تو بچے کو مسجد میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔''اتفاقاً اسی دوران میں بھی مسجد میں داخل ہوا۔چونکہ امام صاحب شناسا تھے لہذا انہوں نے اس''جنگ''میں مجھے بھی شامل ہونے کی دعوت دی اور بچے کے والد کو صلواتیں سنانا شروع کر دیا،لیکن میری حمایت کے برخلاف جب انہوں نے میری زبان سے یہ سنا کہ''بچہ پانچ برس کا ہے جس پر نماز فرض نہیں تو آپ اسے کیوں ابھی سے نماز ہی سے متنفر کر رہے ہیں''۔موصوف خاموش ہوگئے۔دراصل موصوف جس بچے کو اس کے باپ کے سامنے ڈانٹ رہے تھے وہ باپ کسی مدرسے کا فارغ تو نہیں تھا لیکن اسلامیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھتا تھا۔انہوں نے واقعہ کے فوری بعد جو تبصرہ کیا وہ یہ کہ''موجودہ علماء نہ تو دین کو جانتے ہیں اور نہ ہی دنیا سے واقف ہیں۔مدارس اسلامیہ آخر کون سی مخلوق تیار کر رہے ہیں اس کا علم یا تو اللہ رب العزت کو ہے یا پھر ذمہ دارانِ مدارس کو''۔

بظاہر یہ چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن علماء کی شبیہ،علم ومعرفت،تدبر وحکمت بیان کرنے کے لئے بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔معاملہ یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں اسلام اور مسلمان مرکز توجہ بنے ہوئے ہیں جبکہ علماء ومدارس اسلامیہ پر دشمنوں کی خاص نگاہ ہے۔لہذا ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہمارے مدارس کے

طلبہ وطالبات کو ان تعلیمات سے آشنا کیا جاتا جن سے کہ وہ دشمنوں کی شرانگیزیوں کا راست جواب دیتے لیکن المیہ یہ ہے کہ انہیں قرآن وحدیث، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، فقہ وفتاویٰ کی گہرائی وگیرائی کے بجائے ایسے علوم سے روشناس کرایا جارہا ہے جس کا موجودہ دنیا میں کوئی حاصل نہیں۔ المیہ تو یہ ہے کہ قرآن وحدیث کا بھی وہ درک عطا نہیں کیا جارہا ہے جس سے کہ کوئی طالب علم تطبیق وتحقیق کے میدان کا شہسوار ہی بن سکے اور موجودہ ماحول کا جائزہ لے کر عوام الناس کی رہنمائی کرسکے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جامعۃ الفلاح میں کچھ ایسے مضامین پڑھنے کا موقع ملا جس کے بارے میں آج تک سمجھ میں نہیں آسکا کہ اس کا حاصل کیا تھا۔ مثلاً فرقہ ضالہ میں جن فرقوں کے بارے میں آج مدارس میں پڑھایا جارہا ہے ان میں سے بیشتر اب موجود نہیں ہیں۔ لہذا ایک طالب علم ماضی کی شرانگیزیوں سے تو واقف ہوجاتا ہے لیکن اسے حال کی شرانگیزیوں سے نابلد رکھا جاتا ہے نتیجتاً وہ ناسمجھی میں دشمنوں کی چال کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس وقت علماء کرام کی بڑی تعداد اگر عوام کے درمیان معتوب قرار پارہی ہے تو اس میں ان کی کم علمی وکم فہمی کے ساتھ کہیں نہ کہیں مدارس سے حاصل کردہ ''علم'' کی کارفرمائیاں بھی اہم رول ادا کررہی ہیں۔

مدارس کے طلبہ وطالبات کے ساتھ ایک دوسرا المیہ یہ ہے کہ وہ یا تو احساس برتری میں مبتلا رہتے ہیں یا پھر احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں چونکہ احساس برتری بھی احساس کمتری کی ہی دوسری شکل ہے لہذا یہ کیفیت انہیں سماج میں ہم آہنگ ہونے نہیں دیتی اور وہ کم علمی کے باوجود خودساختہ ''عالم'' اور کم فہمی کے باوجود خودساختہ ''فاضل'' کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ لہذا یہ خودساختہ ''عالم وفاضل'' کا ''غرّہ'' کبھی انہیں مطعون کرواتا ہے تو کبھی بیچ چوراہے پر ان کی ٹوپی اترواتا ہے، اور جب پگڑی اچھل جاتی ہے تو وہ منتقم مزاج بن کر اس سماج کو ہی ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے جس نے اسے کسی مقام پر پہنچنے کی نوید سنائی تھی کیونکہ حقیقتاً عوام مدارس کے فارغین کو قائد یا امام نہیں، محض ''پیش امام'' اور ''مؤذن'' سمجھتی ہے، بلکہ عام مسلمانوں کا تائثر یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زکوۃ وخیرات پر پلتے ہیں لہذا سماج میں ان سے کام بھی وہی لینا جانا چاہئے جو انہیں اور ان کے قد کو بلند وبالا نہ ہونے دے۔ جب عمومی طور پر یہ فضا بنی ہوئی ہو تو فارغین مدارس کا کردار کیا ہونا چاہئے اور سماج میں انہیں کس طرح کا رول ادا کرنا چاہئے آپ بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ المیہ یہ بھی ہے کہ کیا ہم نے کبھی ان نکات پر توجہ دی کہ آخر مدارس کے طلبہ ''احساس برتری یا احساس کمتری'' کا کیوں شکار ہوجاتے ہیں؟ مدارس کے طلبہ کیوں مدارس کی چہار دیواری سے نکلنے کے بعد عملی دنیا میں اپنے آپ کو بیگانہ سمجھنے لگتے ہیں؟ مدارس کے طلبہ کو ملّت آخر کیوں صرف مسجد ومدرسہ تک ہی محدود رکھنے کی مشتاق رہتی ہے؟ مدارس کے طلبہ کے بارے میں یہ رجحان کیوں پروان چڑھتا جارہا ہے کہ ان کی نگاہیں دوررس نہیں ہوتیں؟ ادب اور تہذیب وثقافت کے باب

میں مدارس اسلامیہ کے فارغین کی حیثیت کیوں نہیں تسلیم کی جاتی؟ان تمام سے بڑھ کر مدارس کے فارغین کا یہ احساس کیوں عمیق سے عمیق تر ہوتا جاتا ہے کہ مدارس میں گذارے ہوئے لمحات یوں ہی ضائع ہوئے، وہاں سے عملی زندگی میں متحرک رول ادا کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ملا؟

دراصل مدارس کے باب میں دو گروہ مواخذے کے حقدار ہیں۔ پہلا منتظمین کا گروہ جو اکثر و بیشتر مدارس میں جہلا یا ابن الوقتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ چند ایک مدارس ایسے ضرور ہیں جہاں جہلا اور ابن الوقتوں کا زور نہیں البتہ یہ خال خال ہی ہیں۔ دوسرا گروہ ان اساتذہ کا ہے جو خود تو علم کی معراج حاصل نہ کر سکے لہذا وہ اس بات کی بھی کوشش نہیں کرتے کہ کوئی ان کے علم کو چیلنج کر سکے اور ان سے زیادہ اکتساب علم کرے لہذا جب طلبہ ان سے سوالات کرتے ہیں تو یا تو وہ طلبہ کو ہی الجھا دیتے ہیں یا پھر انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرا دیتے ہیں۔ نتیجتاً مدارس کے فارغین بھی جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو یا تو وہ سماج کو الجھا دیتے ہیں یا پھر وہ اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے لئے ایسے حربے اختیار کرتے ہیں کہ سماج کا سنجیدہ طبقہ ان کی ذات سے متنفر رہتا ہے۔

البتہ ان تمام منفی باتوں میں مثبت پہلو یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ کے وہ طلبہ جو اپنی کوششوں سے آگے بڑھتے ہیں۔ دینی وعصری علوم کا راست مطالعہ کرتے ہیں۔ اپنے ذہن وقویٰ کو ہر ایک کے لئے کھولے رکھتے ہیں جبکہ معاشی لحاظ سے بھی اپنی کفالت آپ کرتے ہیں تو وہ نہ صرف سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں بلکہ ملک وملت کو صحیح رخ بھی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہذا ہمارا کردار یہ ہونا چاہئے کہ ہم ''الید العلیا خیر من الید السفلیٰ'' کی عملی تعبیر پیش کر سکیں۔

*ڈائرکٹر معیشت میڈیا پرائیویٹ لمیٹیڈ، ممبئی۔ای میل:danishreyaz@gmail.com

9

عبیداللہ طاهر فلاحی

ہندوستان میں مدارس کی تاریخ بڑی تابناک رہی ہے۔ جب انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں سے حکومت کی زمامِ کار چھن گئی تھی، اس وقت مغربی تہذیب نے مسلمانوں پر ایسی فکری یلغار کی تھی کہ مسلمانوں کے لیے اپنے دین کا تحفظ خطرہ میں نظر آنے لگا تھا۔ مرعوب ذہنوں نے مغربی تہذیب کے ہر عنصر کو اپنا لیا تھا اور اس کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ دینی اقدار اور دینی تشخص پامال ہو گیا تھا۔ ایسے پرآشوب حالات میں ملتِ اسلامیہ ہند کے غیور علمائے کرام نے ملت کو اس طوفان سے نکالنے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک طرف سرسید نے جدید تعلیم کے ذریعہ احیائے نو کی کوشش شروع کی، تو دوسری طرف علمائے دین نے خالص دینی تعلیم کی ترویج واشاعت ہی کو مسئلے کا حل مانتے ہوئے اقدام کیا۔ چنانچہ دارالعلوم

دیوبند کی شکل میں وہ مضبوط قلعہ وجود میں آیا جس نے اس فکری ارتداد کا مضبوطی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

اس وقت سے لے کر آج تک امت مسلمہ میں مدارسِ عربیہ اسلامیہ کا ایک حسین سلسلہ جاری ہے۔ان مدارس کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان کے ذریعہ ملت کے نونہالوں کو دینی علوم سے بہرہ ور کیا جائے، جس سے وہ خود اپنی زندگی سنوار سکیں اور قرآن کی ہدایت (سورہ توبہ:۱۲۲) کے بموجب دوسروں کے لئے بھی مشعلِ راہ اور شمعِ ہدایت بن سکیں۔

اس پورے تاریخی پسِ منظر کو اگر ہم سامنے رکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ مدارس کے فارغین کی ذمہ داریاں بہت اہم اور ہمہ جہتی ہیں۔ وہ دیگر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی طرح عام حیثیت رکھنے والے طلبہ نہیں ہیں، بلکہ ان کی قوم وملت کو ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔اس کا منصفانہ اور آزاد جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا فارغینِ مدارس مطلوبہ توقعات ومقاصد پر کھرے اتر رہے ہیں؟

سب سے بنیادی چیز جو مدرسہ کے ہر فارغ سے مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ وہ دین کا گہرا علم حاصل کرے، صرف سطحی معرفت پر اکتفا نہ کرے۔ایک طرف وہ تفقہ فی الدین کی صفت سے متصف ہو تو دوسری طرف عصری تقاضوں سے بھی واقف ہو۔عربی زبان کے ساتھ ساتھ وقت کی اہم ترین زبان انگریزی میں بھی رسوخ رکھتا ہو۔نیز حکمت کے ساتھ اپنی بات پیش کرے، اور اختلاف وانتشار سے بچتے ہوئے اتحاد و یکجہتی کا پیغام عام کرے، اور اگر ہم مدارس کے نصابِ تعلیم اور مدتِ تعلیم کو دیکھیں تو صاف طور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مدت اور نصاب اس مقصد کی تکمیل کے لیے کافی ہیں۔اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ پھر آخر مطلوبہ نتیجہ کیوں برآمد نہیں ہو رہا ہے؟ میرے خیال سے دون ہمتی، عزم وحوصلہ کی کمی، محنت سے فرار اور جدید تعلیم کے اثرات اس مقصد کی تکمیل میں حارج ہو رہے ہیں۔مدارس میں پڑھنے والے طلبہ میں سے ایک بڑے طبقے کا مقصد ہی یہ بن گیا ہے کہ فراغت کے بعد کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیں اور جدید تعلیم سے آراستہ ہو کر کسبِ معاش میں لگ جائیں۔ایک لحاظ سے دیکھیں تو وہ اس میں حق بجانب ہیں، کیونکہ مہنگائی کے اس دور میں انہیں اپنے گھریلو اخراجات بھی اٹھانے ہیں۔اب ان سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اپنے لیے باعزت معاش کی فکر نہ کریں، عبث ہے۔اس مسئلہ کے تدارک کی ذمہ داری پوری امت پر عائد ہوتی ہے۔اگر مدرسوں کو اہمیت دی جائے، انہیں واقعی وہ مقام دیا جائے جس کے وہ مستحق ہیں، وہاں کے طلبہ واساتذہ، اور دینی تعلیم کو حقیر اور کمتر نہ سمجھا جائے، نیز اس کے ساتھ ساتھ خود طلبہ واساتذہ خودداری کی اعلیٰ صفت سے متصف ہونے لگیں تو شاید مدارسِ دینیہ اپنا وارثینِ انبیاء والا کردار زیادہ خوبی وکمال سے ادا کر سکیں گے۔ پورے معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اساتذہ کے لیے اچھی

تنخواہوں کا بندوبست کرے، اس کے لیے مضبوط نظام بنایا جائے۔ زکوٰۃ وخیرات ہی پر ان کو گذر بسر پر مجبور نہ کیا جائے۔ ان کی عزتِ نفس اور خودداری کو مجروح نہ کریں، کیونکہ یہی علمائے کرام آپ کے قائدین ہیں، ان کے اندر اگر یہ اعلیٰ صفات ہوں گی تو پوری امت کے اندر پیدا ہوتے دیر نہیں لگے گی۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ مدارس جہاں دینی اور عصری دونوں علوم سے بہرہ ور کیا جاتا ہے ان کی اہمیت اور ذمہ داری دونوں غیر معمولی ہے۔ ان مدارس کے فارغین کی بڑی اکثریت جدید تعلیم میں مزید رسوخ پیدا کرنے کے بعد کسبِ معاش میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ان مدارس کے طلبہ اور اساتذہ وذمہ داران کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ ان طلبہ کی ایسی پختہ تعلیم وتربیت کی سخت ضرورت ہے کہ وہ عملی میدان میں جانے کے بعد بھٹکنے نہ پائیں اور مرعوبیت کا شکار نہ ہو جائیں۔ عام طور پر دیکھنے کو یہ ملتا ہے کہ مدرسہ سے نکلنے کے بعد یہ نونہالانِ ملت دینی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر دنیا میں ایسے مست ہو جاتے ہیں کہ لگتا ہے کہ کسی جیل سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں آ گئے ہیں جہاں اب نہ کوئی اخلاقی پابندی ہے اور نہ دینی بندش۔ اس رویے کی سب سے زیادہ اصلاح کی ضرورت ہے، کیونکہ ایسی صورت میں اِن طلبہ ومدارس کے ساتھ ساتھ دین کی بھی شبیہ خراب ہوتی ہے، خصوصاً خالی الذہن حضرات کے سامنے۔ اس لیے اساتذہ کرام اور ذمہ دارانِ مدارس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو ایسا پختہ علم دیں کہ وہ عملی میدان میں جا کر مرعوبیت کا شکار نہ ہوں، بلکہ اپنے قول وعمل کے ذریعہ دعوتِ دین اور شہادتِ حق کا فریضہ انجام دے سکیں۔ ان طلبہ کو بھی سمجھنا چاہئے کہ ان کی ذمہ داری بہت اہم ہے، وہ انتہائی نازک اور حساس مقام پر ہیں جہاں ذرا سی بھی لغزش خود ان کے لیے اور پوری ملت کے لیے شرمندگی اور نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔

*اسلامی یونیورسٹی، مدینہ منورہ۔ ای میل:obaidullahtahirfalahi@gmail.com

---

نوٹ: (۱) ''فکر وآگہی'' کے نام سے شروع ہونے والا یہ کالم ان شاءاللہ حیات نو کا مستقل کالم رہے گا۔

(۲) آئندہ شمارے کا موضوع ''**امت کے داعیانہ کردار کی بازیافت۔ کیوں اور کیسے**؟'' متعین کیا گیا ہے۔

(۳) اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اہل فکر ونظر اپنے افکار وخیالات اس طرح ارسال کریں کہ **۳۰/ اکتوبر** تک ہمیں لازماً موصول ہو جائیں۔

(۴) کوشش رہے کہ تحریر جامع اور مختصر ہو، اور حیات نو کے ۲/ صفحات سے زیادہ طویل نہ ہو۔

اردو تراجم قرآن پر ایک تنقیدی نظر

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

تراجم قرآن کے جائزوں کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ بسا اوقات ایک غلطی شروع کے

کسی مترجم سے ہوئی اور وہ آگے بھی نقل ہوتی رہی، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ ابتدائی دور کے مترجمین نے غلطی نہیں کی اور وہ بعد میں در آئی۔

راقم کا مقصود غلطیوں کو نمایاں کرنا نہیں، بلکہ ترجموں کے تقابلی مطالعہ کی افادیت دکھانا ہے، اور ترجمہ کے عمل میں نظر ثانی اور اجتماعی کاوش کی اہمیت پر زور دینا ہے، کہ فقہی مسائل میں اجتماعی اجتہاد جس قدر ضروری ہے، اس سے زیادہ ضرورت ترجمہ قرآن میں اجتماعی مساعی کی ہے۔

تقابلی مطالعہ بڑی حد تک یہ تأثر بھی قائم کرتا ہے کہ بیشتر مقامات پر اگر بعض مترجمین سے کوئی چوک ہوئی ہے تو دوسرے مترجمین کے یہاں اس چوک کا تدارک کرلیا گیا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں کچھ مثالوں کے ذریعہ مختلف نوعیت کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس مضمون کی تیاری میں سب سے اہم حصہ عم محترم مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی حفظہ اللہ کے افادات کا ہے جنہیں تفہیم القرآن اور تدبر قرآن کے ریویو کے دوران نوٹ کرنے کا موقعہ ملا۔ زیر نظر تحریر میں جن غلطیوں کی طرف نشان دہی کی گئی ہے وہ عموماً مذکورہ دونوں ترجموں میں پائی جاتی ہیں۔

(۱) کبھی ضمیر غائب کا مرجع متعین کرنے میں غلطی ہوجاتی ہے۔

☆ أُولَئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ۔ (الکهف: ۳۱)

متعدد مترجمین نے اس آیت کا یوں ترجمہ کیا: ''ان کے لئے سدا بہار جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی''۔

اس ترجمہ کی رو سے جنتوں کے یا بعض تراجم میں جنتوں میں ان کے محلوں کے نیچے نہریں بہنے کا بیان ہے۔ جبکہ آیت میں اہل جنت کے نیچے نہریں بہنے کی بات ہے، کیونکہ تَحْتِهِمُ میں ضمیر 'ھم' ہے جو اہل جنت کی طرف ہی لوٹ سکتی ہے، اگر ضمیر 'ھا' ہوتی تو جنتوں کی طرف لوٹتی۔

شاہ عبدالقادر کے ترجمہ میں اس کا خیال کیا گیا ہے، ان کا ترجمہ ہے: ''ایسوں کو باغ ہیں بسنے کے، بہتی ان کے نیچے نہریں''۔ جوناگڑھی نے بھی ایسا ہی ترجمہ کیا: ''ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی''۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ قرآن میں مذکورہ ذیل دو اور مقامات پر بھی جنتیوں کے نیچے نہریں بہنے کا ذکر ہے، اور وہاں جنت کا ذکر نہیں صرف جنتیوں کا ذکر ہے، یعنی قطعی طور سے اہل جنت کے نیچے نہریں بہنا مراد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ. (یونس: ۹)

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَار. (الاعراف: ۴۳)

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جنت کے نیچے نہریں بہنے کا مطلب سمجھ میں آتا ہے، گرچہ اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ جنت اوپر ہوگی اور نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جنت میں درختوں کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، اہل جنت کے نیچے نہریں بہنے سے کیا مراد ہے، اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ جس طرح قرآن کے بعض مقامات پر جنت کے نیچے نہریں بہنے کا ذکر کیا گیا اور اس سے جنت کے حسن و جمال کو ظاہر کیا گیا، اسی طرح اہل جنت کی خوشحالی ظاہر کرنے کے لئے مذکورہ مقامات پر خود ان جنتیوں کے نیچے نہریں بہنے کا ذکر کیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون نے جب موسی کے مقابلے میں اپنی خوشحالی اور اقتدار میں اپنی برتری ظاہر کرنا چاہی تو یہی بات کہی۔ اس نے کہا:

وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِيْ مِن تَحْتِيْ۔ (الزخرف: ۵۱)

(اور یہ نہریں میرے نیچے بہتی ہیں۔)

(۲) کبھی نحو کے کسی قاعدے کو برتنے میں غلطی ہوجاتی ہے۔

☆ قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَاداً لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَداً. (الكهف: ۱۰۹)

اس کا ترجمہ عام طور سے مترجمین نے یوں کیا ہے: ''اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے لئے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہوجائے گا، اگر چہ ہم اس کے ساتھ اس کے مانند اور سمندر ملا دیں''۔

اس میں زمانہ مستقبل کا ترجمہ کیا گیا ہے، حالانکہ لو شرطیہ کے بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ وہ زمانہ ماضی کے لئے آتا ہے، خواہ جملہ شرط میں فعل ماضی ہو یا فعل مضارع ہو۔

قاعدہ کی رو سے درست ترجمہ یوں ہوگا: ''اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے لئے سمندر روشنائی بن جاتا تو میرے رب کی نشانیوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہوجاتا، اگر چہ ہم اس کے ساتھ اس کے مانند اور سمندر ملا دیتے''۔

(۳) کبھی کسی لفظ کے معنی کے سلسلے میں تساہل ہوجاتا ہے۔

☆ سورۃ الناس اور سورۃ الفلق اور دیگر مقامات پر متعدد مترجمین نے أعوذ کا ترجمہ کیا ہے: ''میں پناہ مانگتا ہوں''، حالانکہ پناہ مانگنے کے لئے استعاذہ آتا ہے، کچھ مترجمین نے ''پناہ میں آتا ہوں''، اور ''پناہ لیتا ہوں'' کیا ہے، لفظ کے لحاظ سے یہی ترجمہ درست ہے۔ بعض مترجمین نے ''پناہ میں

آیا''، یعنی ماضی کا ترجمہ کیا ہے، جبکہ یہاں فعل ماضی نہیں ہے۔

(۴) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، لیکن مترجم سے سیاق کے لحاظ سے مناسب معنی اختیار کرنے میں لغزش ہو جاتی ہے۔

☆ إِنَّ اللَّهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ۔ (النساء : ٤٨)

☆ إِنَّ اللَّهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاء ۔ (النساء: ١١٦)

بعض مترجمین نے ترجمہ کیا: ''اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے''۔

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ہے: ''اور بخشتا ہے اس سے نیچے جس کو چاہے''۔

دون کا ترجمہ اس کے سوا بھی ہوسکتا ہے، اور اس سے کمتر بھی ہوسکتا ہے، دوسری نصوص کی روشنی میں کم تر کا ترجمہ درست ہے۔

صحیح ترجمہ یہ ہوگا: ''اللہ شرک کو معاف نہیں کرتا۔ اس سے کمتر درجہ کے جو گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے''۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض گناہ شرک سے بھی بڑے ہوتے ہیں، جیسے خدا کے حضور کبر شرک سے بڑا گناہ ہے، ابلیس کا گناہ شرک نہیں ہے، اس کے لئے قرآن مجید میں استکبر کا لفظ آیا ہے۔

☆ كَعَصْفٍ مَّأْكُول۔ (الفیل:٥)

"مَّأْكُول'' کے دو معنی ہو سکتے ہیں، کھائی ہوئی چیز، یا کھانے کی چیز۔

عام طور سے مترجمین نے آیت کے اس ٹکڑے کا ترجمہ کیا ہے: ''کھائے ہوئے بھس کی طرح''۔

ترجمہ بالا پر اشکال یہ آتا ہے کہ کھائے ہوئے بھس سے کیا مراد ہے، کھانے کے بعد تو بھس گوبر بن جاتا ہے، سیاق کے لحاظ سے مناسب یہ ہے کہ یہاں ماکول کا ترجمہ ''کھایا ہوا'' کے بجائے ''کھانے کے قابل'' کیا جائے، ترجمہ ہوگا: ''کھانے کا بھس بنا کر رکھ دیا''۔ محمد فاروق خان کے ہندی ترجمہ میں ہے: ''جیسے کھانے کا بھوسا ہو''۔

(۵) دو ملتے جلتے الفاظ کے درمیان باریک فرق میں تساہل بھی غلطی کا سبب بن جاتا ہے۔

☆ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ۔ (التکاثر:٨)

''النَّعِيمِ'' کا ترجمہ عام طور سے لوگ نعمت کر دیتے ہیں، حالانکہ نعمت اور نعیم میں فرق ہے، نعمت کے لئے عربی میں ''نعمة'' آتا ہے جس کا مطلب ''اللہ کی بخشی ہوئی چیزیں'' ہوتا ہے، جبکہ نعیم کا مطلب ہوتا ہے ''آرام و آسائش''۔ بخشش اور آسائش میں جو فرق ہے وہ زبان کا ذوق رکھنے والے آسانی سے

سمجھ سکتے ہیں۔
شاہ عبدالقادر نے اس آیت میں آرام ترجمہ کیا ہے، سورہ یونس آیت ۹ر میں بھی جنات النعیم کا ترجمہ ''باغوں میں آرام کے'' کیا ہے۔ لیکن مائدہ ۶۵ر میں جنات النعیم کا ترجمہ نعمت کے باغوں کیا ہے۔
سورہ تکاثر میں ''نعیم'' سے مراد آسائش ہے اس کی تائید سورہ انبیاء کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے:
لا تَـرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ۔ (الانبیاء: ۱۳) جو مفہوم ''مَـا أُتْـرِفْتُمْ فِيهِ'' کا ہے تقریباوہی نعیم کا بھی ہے۔ یعنی آرام وآسائش کی وہ حالت جو اس دنیا میں حاصل رہی۔

☆ فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ۔ (الفجر:۱۵)
آیت مذکورہ میں ''نَـعَّـمَـهُ'' کا لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ عموماً نعمت دینے سے کیا گیا ہے، دراصل نعم نعیم کے لئے ہوتا ہے، اور نعمت کے لئے انعم ہوتا ہے، آیت مذکورہ میں نعمہ کا ترجمہ آسائش دینے سے کیا جائے گا۔

(۶) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت میں ضمیر کا استعمال ہوتا ہے، اور مترجم اپنی تفسیر کے مطابق ضمیر کے بجائے ضمیر کا مرجع ذکر کر دیتا ہے، یہ طریقہ درست معلوم نہیں ہوتا، اس سے قاری کے غور وفکر کے وہ امکانات محدود ہو جاتے ہیں جو خود آیت نے فراہم کئے تھے۔

☆ فَنَادَاهَا مِن تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي۔ (مریم:۲۴)
اس کا ترجمہ ہوگا: ''پس اس نے اس کے نیچے سے اسے آواز دی کہ مغموم نہ ہو''۔ جیسا کہ شاہ عبدالقادر نے کیا ہے کہ: پھر آواز دی اس کو اس کے نیچے سے کہ غم نہ کھا۔
بعض مترجمین نے ترجمہ کیا: ''پس (کھجور کے) نیچے سے فرشتہ نے اس کو آواز دی کہ مغموم نہ ہو''۔
اگر آیات پر غور کیا جائے تو یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ عیسی نے اپنی ماں مریم کے نیچے سے اس کو آواز دی اور کہا کہ مغموم نہ ہو۔ اور یہی مفہوم زیادہ صحیح لگتا ہے، کیونکہ عیسی کی اس ندا کے بعد ہی مریم کو معلوم ہوا کہ عیسی بولتے ہیں، اور اسی لئے انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں کے سوالوں کے جواب میں عیسی کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ اگر ترجمہ میں ضمیر کی جگہ فرشتہ ذکر کر دیا جائے تو قاری کے لئے دوسرے امکان پر سوچنے کا موقعہ ختم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ امکان آیت کے الفاظ خود فراہم کر رہے ہیں۔ ہاں اگر قاری کی سہولت پیش نظر ہے تو ضمیر کو ذکر کر کے اس کا مرجع قوسین میں ذکر کر دینا چاہئے۔

(۷) بسا اوقات فعل کے بعد آنے والا حرف فعل کے معنی کو تبدیل کر دیتا ہے۔ مترجم کی نگاہ کبھی اس تبدیلی کا خیال کرنے میں چوک جاتی ہے۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ وَقَالُواْ مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِن آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ۔ (الاعراف: ۱۳۲)

☆ قَالُواْ يَا هُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْ آلِهَتِنَا عَن قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِين۔ (هود:۵۳)

☆ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِين۔ (یونس:۷۸)

☆ فَمَا آمَنَ لِمُوسَى إِلاَّ ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِه۔ (یونس:۸۳)

ایمان کے ساتھ جب ''باء'' آتا ہے تو مطلب ہوتا ہے اس پر ایمان لانا جس کا ''باء'' کے بعد ذکر ہے جیسے آمنت باللہ۔ اور جب لام آتا ہے تو مطلب ہوتا ہے اس کی ''بات ماننا'' جس کا لام کے بعد ذکر ہے۔ مذکورہ بالا آیتوں میں لام آیا ہے، اس لئے چاروں جگہ ترجمہ ''بات ماننے'' کا ہونا چاہئے، ترجمہ نگاروں میں سے بعض نے ایسے سارے مقامات پر مذکور نبی پر ''ایمان نہ لانا'' یا اس کو ''نہ ماننے'' کا ترجمہ کیا ہے۔ بعض مترجمین نے کچھ مقامات پر اس کی رعایت کی ہے اور بعض مقامات پر نہیں کی۔

اسی طرح کفر کے ساتھ جب ''باء'' آتا ہے تو کفر وانکار کے معنی میں ہوتا ہے، اور براہ راست مفعول کی ضمیر آتی ہے تو ناشکری کرنے کا معنی ہوتا ہے۔

☆ أَلا إِنَّ عَاداً كَفرُواْ رَبَّهُم۔ (هود:٦٠)

☆ أَلاَ إِنَّ ثَمُودَ كَفرُواْ رَبَّهُمْ۔ (هود:٦٨)

مذکورہ دونوں آیتوں کا درست ترجمہ یہ ہے: ''سنو عاد نے اپنے رب کی ناشکری کی''، ''سنو ثمود نے اپنے رب کی ناشکری کی''۔ لیکن عام طور سے لوگوں نے کفر اور انکار کا ترجمہ کیا ہے۔ حالانکہ سورہ بقرہ میں وَاشْكُرُواْ لِي وَلاَ تَكْفُرُون۔ (البقرة: ۱۵۲) کا ترجمہ میرے علم کی حد تک سارے مترجمین نے ''ناشکری نہ کرو''، یا ''کفران نعمت نہ کرو''، کیا ہے۔

☆ وَلاَ تَعْزِمُواْ عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىَ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَه۔ (البقرة: ۲۳۵)

بعض مترجمین نے مذکورہ ٹکڑے کا ترجمہ کیا: ''اور عقد نکاح باندھنے کا فیصلہ نہ کرو''، یا ''عقد نکاح کا عزم نہ کرو''۔

دراصل عزم کے ساتھ علی ہوتا تو یہ ترجمہ درست ہوسکتا تھا، لیکن یہاں علی مذکور نہیں ہے، اس لئے ترجمہ ہوگا: ''عقد نکاح کو پختہ نہ کرو''۔ یعنی نکاح کی گرہ نہ باندھو۔ شاہ عبدالقادر نے یہی ترجمہ کیا ہے: ''اور نہ باندھو گرہ نکاح کی''۔

(۸) بعض الفاظ انسانوں کے شایان شان ہوتے ہیں، لیکن اللہ کے لئے ان کا استعمال مناسب نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح کا ایک لفظ ''کاش'' ہے، جس کے لئے عربی میں ''لو'' آتا ہے۔

☆ لَبِئْسَ مَا شَرَوْاْ بِهِ أَنفُسَهُمْ لَوْ كَانُواْ يَعْلَمُون۔ (البقرة: ۱۰۲)

☆ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُواْ واتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّه خَيْرٌ لَّوْ كَانُواْ يَعْلَمُون۔ (البقرہ:۱۰۳)

☆ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُواْ إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّهِ جَمِيعا۔ (البقرہ: ۱۶۵)

مذکورہ تینوں مقامات اور ان جیسے دیگر مقامات پر بعض مترجمین نے ''لو'' کا ترجمہ ''کاش'' سے کیا ہے، ''کاش'' کا لفظ انسانوں کے لئے تو درست ہے، لیکن اللہ تعالی کے لئے اس لفظ کا استعمال مناسب نہیں ہے، اس کی جگہ (اگر کہیں) کہنا مناسب ہے۔ ''کاش وہ جانتے'' کے بجائے، ''اگر کہیں وہ جانتے''۔

(۹) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لفظ کے اندر تو ایک مفہوم کی گنجائش ہوتی ہے لیکن پورے جملہ کا مفہوم لفظ کے اس مفہوم کو اِبا کرتا ہے۔

☆ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَة۔ (النساء:۷۷)

کچھ مترجمین نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا کہ خدا سے ڈرنا چاہئے، یا اس سے بھی بڑھ کر''۔

اس ترجمہ پر اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اللہ سے جو ڈر مطلوب ہے کیا اس سے زیادہ کسی اور سے ڈرا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، اللہ تعالی سے جتنا ڈرنا چاہئے اس کی کوئی حد ہی نہیں ہے کہ یہ کہا جا ئے کہ اس سے بھی بڑھ کر۔ یعنی اللہ سے جتنا ڈرنا چاہئے اس سے زیادہ کسی اور چیز سے ڈرا ہی نہیں جا سکتا ہے۔

درست ترجمہ یہ ہے کہ: ''لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرتے ہیں یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر''۔

(۱۰) قرآن مجید میں ایجاز کے اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے، کم الفاظ میں زیادہ مفہوم کی ادائیگی دراصل قرآن مجید کا ایک خوبصورت انداز ہے۔ کبھی اس اسلوب سے مترجم کی نگاہ چوک جاتی ہے۔

☆ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ۔ (النساء: ۱۳۵)

متعدد مترجمین اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ''انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو''۔

دراصل اس آیت میں قوامین آیا ہے، اور شہداء آیا ہے، اس کے علاوہ بالقسط آیا ہے جو بیک وقت دونوں سے متعلق ہے، اور للہ آیا ہے وہ بھی دونوں سے متعلق ہے۔ اگر عبارت کو کھولا جائے تو یوں ہوگی: كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ لِلّه شُهَدَاء بِالْقِسْطِ لِلّهِ۔ گویا اللہ کی خاطر انصاف کے علم بردار بنو اور اللہ کی خاطر انصاف کے گواہ بنو۔ یعنی دونوں ہی آیتوں میں للہ اور بالقسط دونوں الفاظ قوامین سے بھی متعلق ہیں اور شہداء سے بھی۔ قوامین سے مراد عملی کردار اور شہداء سے مراد قولی شہادت ہے۔ جبکہ مترجمین عام

طور سے بالقسط کو صرف قوامین سے جوڑتے ہیں، اور للہ کو صرف شہداء سے متعلق بناتے ہیں۔

درست ترجمہ یوں ہوگا: ''خدا واسطے انصاف کے علمبردار اور اس کے گواہ بنو''۔

☆ وَلَا تَقْعُدُواْ بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيْلِ اللّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجاً۔ (الاعراف: ٨٦)

بعض مترجمین نے ترجمہ اس طرح کیا: ''اور ہر راستے پر یوں نہ بیٹھو کہ راہگیروں کو ڈراؤ اور اللہ کی راہ سے انہیں روکو جو اس پر ایمان لائے اور اس میں کجی چاہو''۔

درست ترجمہ: ''اور ہر راستے میں بیٹھ کر جو ایمان لائے انہیں دھمکیاں نہ دو اور اللہ کی راہ سے نہ روکو اس میں کجی کی خواہش کے ساتھ''۔

دراصل ''من آمن بہ'' دونوں افعال سے متعلق ہے، یعنی وہ دھمکیاں بھی اہل ایمان کو دیتے ہیں اور روکتے بھی اہل ایمان کو ہیں۔

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ یوں ہے: ''اور مت بیٹھو ہر راہ پر ڈر کے، اور روکتے اللہ کی راہ سے، اس کو جو کوئی یقین لاوے اس پر، اور ڈھونڈتے اس میں عیب''۔ یہ ترجمہ عمدہ ہے، البتہ اس میں (ڈر کے) لگتا ہے کتابت کی غلطی ہے، ڈراتے ہوگا۔

(۱۱) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو افعال آتے ہیں اور اس کے بعد جار مجرور آتا ہے، اور وہ جار مجرور کس فعل سے متعلق ہے یہ طے کرنے میں چوک ہو جاتی ہے، اگر سیاق وسباق پر غور کریں اور نحو کے قواعد کو باریکی سے ملحوظ رکھیں تو درست ترجمہ تک رسائی ہو سکتی ہے۔

☆ إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لاَخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ وَلَـكِن لِّيَقْضِيَ اللّهُ أَمْراً كَانَ مَفْعُولاً لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَى مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ وَإِنَّ اللّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ (الانفال: ٤٢)

عام طور سے مترجمین نے آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو، اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے''۔

جبکہ درست ترجمہ یہ ہے: ''تاکہ جو حجت سے (دلیل روشن کی رو سے) ہلاک ہو چکا ہے وہ ہلاک ہو جائے، اور جو حجت سے (دلیل روشن کی رو سے) زندہ رہنے کا مستحق ہے وہ زندہ رہے''۔

یعنی لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ میں عَن بَيِّنَةٍ متعلق ہے هَلَكَ سے نہ کہ لِّيَهْلِكَ سے جیسا کہ عام مترجمین نے لیا ہے۔

اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ عام ترجمہ کے لحاظ سے ''ھلک'' اور ''حی'' کی جگہ فعل مضارع یعنی

''یھلک''اور''یحیی'' آتا۔موقع ومحل سے بھی عام ترجمہ کی تائید نہیں ہوتی۔کیونکہ حجت تو جنگ بدر سے پہلے تمام ہو چکی تھی اب تو ہلاکت کے مستحقین کو ہلاکت سے دوچار ہونا تھا۔

(۱۲) ایک مشہور ترجمہ کے بالمقابل کبھی ایک غیر مشہور ترجمہ مفہوم کے لحاظ سے زیادہ مناسب لگتا ہے۔

☆ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهٖ۔ (البقرہ: ۲۳۳)

اس آیت کا ترجمہ عام طور سے لوگوں نے یہ کیا ہے کہ:''نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے، اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے''۔

اس آیت کا ترجمہ شاہ عبدالقادر نے اس سے بالکل مختلف کیا ہے،:''نہ ضرر چاہے ماں اپنی اولاد کا اور نہ لڑکے والا اپنی اولاد کا''۔

بالفاظ دیگر نہ تو ماں ایسا رویہ اختیار کرے کہ اس کے بچے کو نقصان پہنچے اور نہ ہی باپ ایسا رویہ اختیار کرے جو اس کے بچے کے لئے نقصان دہ ہو۔یہ ترجمہ اس لئے بھی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ میں بچہ کو لے کر جو تنازعات ہوتے ہیں ان کا راست نقصان اصل میں بچہ ہی کو پہنچتا ہے۔ والدین اپنی اپنی انا کے لئے اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ خود بچہ کا مفاد داؤں پر لگ جاتا ہے۔ بولدہ میں حرف''باء'' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔کیونکہ فعل ضار یضار کا صلہ''باء'' آتا ہے۔اگر علت کا مفہوم ہوتا جیسا کہ مذکورہ بالا ترجمہ میں ہے تو اس کے لئے''لام'' آتا۔

☆ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ۔ (البقرہ: ۲۸۲)

اس ٹکڑے کا ترجمہ عام طور پر مترجمین نے یہ کیا ہے کہ:''اور کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے''۔اس کا ایک اور ترجمہ ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ''کاتب اور گواہ نقصان نہ پہنچائیں''۔احمد رضا خاں نے مشہور ترجمہ کے ساتھ اسے بھی ذکر کیا ہے۔یہ ترجمہ زیادہ مناسب اس وجہ سے ہے کہ کاتب کو نقصان پہنچانے کی کوئی صورت عام طور سے نہیں بنتی، وہ تو قرض کے لین دین کے وقت کتابت کر کے اپنی راہ لیتا ہے، اس وقت کوئی اس سے ناراض بھی نہیں ہوتا ہے کہ اسے نقصان پہنچائے، اس کے برعکس کاتب لکھتے وقت اور شاہد گواہی دیتے وقت فریقین میں سے کسی کو بھی ناحق نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

☆ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (الاعراف:۸)

عام طور سے مترجمین نے مذکورہ ٹکڑے کا ترجمہ اس طرح کیا:''اس دن وزن دار صرف حق ہوگا''۔یا''اس دن وزن برحق اور یقینی ہے''۔مفہوم اور زبان کے قواعد کی رو سے شاہ عبدالقادر کا ترجمہ درست ہے گو کہ وہ مشہور نہیں ہو سکا کہ:''تول اس دن ٹھیک ہے''۔یعنی اس دن صحیح صحیح تولا جائے گا، اور اس میں کوئی غلطی نہیں ہوگی۔

(۱۳) کسی آیت کا یا آیت کے جزء کا ایسا ترجمہ بھی اہل علم کے لئے قابل توجہ ہوسکتا ہے جو مترجمین میں سے کسی نے اب تک اختیار نہیں کیا۔

☆ فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ۔ (الحج: ٤٥)

اس آیت کا ترجمہ طاہر القادری نے یوں کیا ہے: ''پھر کتنی ہی (ایسی) بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر ڈالا اس حال میں کہ وہ ظالم تھیں پس وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں، اور (ان کی ہلاکت سے) کتنے کنویں بے کار (ہوگئے) اور کتنے مضبوط محل اجڑے پڑے (ہیں)'' عام طور سے مترجمین نے ایسا ہی ترجمہ کیا ہے۔

اس میں غور طلب حصہ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا ہے، ''خَاوِيَةٌ'' کے اصل معنی ویران اور خالی کے آتے ہیں، لیکن کسی نے بھی اس آیت میں اس کا ترجمہ ویران سے نہیں کیا بلکہ گری ہوئی اور ڈھی ہوئی ترجمہ کیا۔ حالانکہ قصر مشید سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ بہت سارے محل ہیں جو ویران تو ہیں مگر ڈھے اور گرے ہوئے نہیں ہیں۔

غالباً عَلَى عُرُوشِهَا کی وجہ سے مترجمین اس معنی کی طرف گئے، کیونکہ سورہ نمل کی آیت فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا۔ (٥٢) میں ''خَاوِيَةً'' کا ترجمہ بہت سارے مترجمین نے خالی ویران اور اجڑے ہوئے کیا ہے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی حفظہ اللہ نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''پھر کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر ڈالا اس حال میں کہ وہ ظالم تھیں پس وہ اپنی چھتوں کے برقرار رہتے ہوئے ویران پڑی ہیں''۔ خَاوِيَةً یعنی ویران اور عَلَى عُرُوشِهَا یعنی چھتوں کے ہوتے ہوئے۔

مذکورہ ذیل قرآنی آیتوں میں بھی خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا کا اسی طرح کا ترجمہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

☆ أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ (البقرہ: ٢٥٩)

☆ وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَى مَا أَنفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا۔ (الكهف: ٤٢)

☆ فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا۔ (النمل: ٥٢)

کچھ تعلیم کے بارے میں

ڈاکٹر وسیم احمد فلاحی*

تعلیم کے لغوی اور اصطلاحی معنی اس میدان کے ماہرین سے معلوم کریں گے۔ ہمارا مطمح نظر اس وقت وہ طریقۂ تعلیم ہے جو زمانے سے ہمارے یہاں رائج ہے۔ اس ضمن میں خود یہ سوال ابھرے گا کہ علم کیا ہے۔ اس کی بھی تعریف بتانا بہت دشوار ہے، اگر پوچھا جائے، نہ پوچھے جانے پر بہت آسان ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی خطبات ہمارے لیے بہت کارآمد ہیں، اگر ہم گاہے بگاہے ان کا تذکرہ کرتے رہیں، ان خطبات کا جو جوہر ہے وہ یہ کہ ایک طالب علم کے ذہن کی پوری پوری پرورش ہوجائے۔ یہ ہے تعلیم کا مقصود۔ انہیں کے بقول ''قدرت بچے کی شخصیت کی تشکیل کے بے شمار امکانات میں سے کسی ایک امکان کی تکمیل چاہتی ہے۔'' گھر بننے تک کے جو مراحل ہیں، وہ بہت صبر آزما ہیں اور ان مراحل میں ماحول کا پورا پورا تعاون درکار ہوگا۔ ''امکانات'' کا مذکورہ بالا لفظ بہت مبہم ہے اور اس کا مبہم رہنا ہی بہت اچھا ہے۔ ہماری مشکل اس مبہم کو واضح اور مطلق کو مقید کردینے میں ہے۔ تنوع اصل فطرت ہے اور تکرار سے اسے اِبا ہے، خاص طور سے انسانوں کے بارے میں۔ ہماری دانش گاہوں کو صرف سنگہائے میل ہونا چاہیے اور قدرت کو اس کا بھرپور موقع دینا چاہیے کہ اپنے شاہکار کی حسب خواہش وضرورت صورت گری کرسکے۔ البتہ اس سفر کے تمام انتظامات میں اعتماد کے عنصر کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ بلاشبہ خطرات بھی ہیں، مگر انعامات اس سے بھی زیادہ۔ جہاں تک خطرات کی بات ہے یہ زمین پر ہمارے کیریئر کا ایک لازمی جزء ہے (البلد: ۴) ایک آزاد اور ذمہ دار شخصیت ہمارا مقدر ہے (الاحزاب: ۷۲) اگر یہ طے ہے تو اس سے فرار بے معنی ہے اور لاحاصل بھی۔ ہمیں یہ آزادی نہیں ہے کہ ہم اپنی آزادی سے دست بردار ہوجائیں۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ نبرد آزما ہونا اور خطرات سے کھیلنا ہی جب ہماری تقدیر ہے تو اس کے لیے تیار ہوجانا عین دانشمندی ہے۔

جدوجہد ہی راز حیات ہے...... جسمانی سے زیادہ روحانی اور عقلی۔ یہی فرق ہے انسانوں

اور بہائم میں۔ واجب ہے کہ ذہن واخلاق کی تشکیل کے ادارے خطرات کے ساتھ ساتھ مواقع سے بھی آگاہ ہوں۔ قدرت آخراس روئے زمین پر کیا اور کیسے چاہتی ہے کسے معلوم۔ انسانی عقل ابھی اس درجہ پر نہیں پہنچی ہے کہ اس بارے میں کوئی آخری حکم لگا سکے۔ ہوسکتا ہے کہ قدرت ہم سے چاہتی ہو کہ ہم اس دنیا کو جنت نشاں بنا کر یہ ثابت کر دیں کہ ہاں ہمیں جنت سے دلچسپی ہے۔ بالآخر اگر یہی معیار ٹھہرا ہمارے عرصۂ حیات کے نیک انجام یا بدانجام ہونے کا تو کامیابی کس کی ہوگی کون کہہ سکتا ہے۔ دعویٰ ہم سب کا ہے مگر میزان کس کی بھاری ہوگی یہ حتمی نہیں ہے۔

دوسرا اہم سوال خود علم کا ہے جس کی ترسیل کے لیے یہ ادارے وجود میں آئے ہیں۔ غیر شعوری طور پر تقریباً بالاتفاق ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ معلوم کو جان لینے کا نام علم ہے جو بہت مختلف ہے مغربی تصور علم سے وہاں ابتکار کے ساتھ غیر معلوم کو دریافت کر لے جانا، تصور علم مانا جاتا ہے۔ اپنی کنہ میں اسے، فی الحقیقت، اسلامی تصور علم سمجھا جائے گا اگر ہم اقبال کے اس تجزیہ کو فراموش نہ کریں کہ مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب کی ہی ترقی یافتہ شکل یا توسیع ہے۔ اقبال کے اس خیال سے کسی کو اختلاف بھی ہوسکتا ہے، کسی معقول بنیاد پر۔ تاہم قرآن کا یہ منہج ناقابل انکار ہے کہ چھوٹے چھوٹے محسوس حقائق کے تحلیل وتجزیہ سے غیر محسوس (بالغیب) بڑی بڑی حقیقتوں اور بالآخر حقیقۃ الحقائق تک پہنچا جائے، یہی مابہ الامتیاز ہے انسان کا۔

غیر معلوم تک پہنچنے کی شعوری کوشش اور نظام تعلیم میں اس کا پورا پورا خیال اور تحریک وتشویق ایک مبارک اقدام ہوگا۔ بہت ضروری ہے کہ طریق تدریس اور اس سے زیادہ مواد تدریس کو بنظر غائر دیکھا جائے اور ایک نئے طرز فکر کا آغاز ہو۔ یہ ایک نسبتاً انجانی رہ گزر ہوگی مگر اس پر چلنا ضروری ہے۔ نظر ثانی کا کام بہت دلچسپ نہیں ہے، اس سے زیادہ دلچسپ اور بہت سے کام ہیں اور داد وتحسین بھی نقد ہے۔ ملت کے درد کا راگ بھی حلاوت سے پر ہے اور آفریں پر منتج ہے۔ اگر دلچسپ نہیں ہے تو وہ 'بارہ ماسی ماتھے سے پسینہ بہانے والا کام' ...... ایک گمنام گوشے میں ...... جو تمدن کی بنیاد کا پتھر ثابت ہوتا ہے اور جو وظیفہ ہے دانش گاہوں کا۔ مقصود کیا ہے اور کس چیز کی طلب میں لگے ہیں اسی کے جان لینے میں تہذیب کا راز مضمر ہے۔

ہر ہلاکِ امتِ پیشیں کہ بود
زاں کہ برصندل گماں کردند عود

تعلیم اور تعلیمی اداروں کے قبلہ اور نہج کی درستگی سارانش ہے اسلامیان ہند کے مستقبل کی طویل حکایت کا۔ یہ ایک ایجنڈا سارے ایجنڈوں سے بڑھ کر ہے۔

●●

* صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، پرسٹن یونیورسٹی عجمان۔

عالم عرب میں تبدیلی کی لہر

ڈاکٹر محمد ارشد*

تبدیلی اور تغیر ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ تبدیلی و تغیر کا یہ عمل فرد کی سطح پر بھی ہوتا ہے اور معاشرے کی سطح پر بھی۔ فرد کی زندگی چونکہ مختصر ہوتی ہے اس لیے اس میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں جلد محسوس کر لی جاتی ہیں، جبکہ سماجی تبدیلیاں اس کی عمر کے مطابق نسبتاً دیر میں محسوس ہوتی ہیں۔ گزشتہ دنوں، اب سے تقریباً تین برس قبل، عالم عرب میں سماجی و سیاسی تبدیلی کے عمل کا اظہار شروع ہوا تھا۔ تیونس سے عوامی انقلاب کی ایک آندھی چلی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تیونس سمیت مصر اور لیبیا جیسے آمریت کے مضبوط قلعوں کو ایک آن میں مسمار کر دیا۔ عرب میں عوامی بیداری کی جس لہر کا آغاز تیونس سے ہوا تھا وہ کوئی اچانک حادثہ نہیں تھا۔ ۲۶ سالہ سبزی فروش نوجوان بوعزیزی کا ریاستی جبر اور ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج ایک نقطہ آغاز تھا، اس ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف جو پچھلی کئی دہائیوں سے عرب عوام کے خلاف جاری ہے۔

ہمارے یہاں لکھنے اور بولنے والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے جو عالم عرب میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کو ناگہانی اور اتفاقی قرار دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عالم عرب کے عوام اور خاص طور سے نوجوانوں میں اپنے سیاسی و اقتصادی نظام کے خلاف جو بے چینی پائی جاتی ہے اس کا اندازہ ۲۰۱۰ء کے اواخر سے پہلے تک زیادہ تر لوگوں کو نہیں تھا۔ یہاں تک کہ عالم عرب کے بیشتر سیاسی حکمراں بھی اس عوامی بے چینی سے بے خبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی بے چینی کا لاوا جب پھٹا تو نہ تو ان کے پاس، اور نہ ہی ان کے مغربی اور دیگر پشت پناہوں کے پاس، اِس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوئی تدبیر تھی۔

اس وقت عالم عرب میں سب سے زیادہ مشکل حالات مصر میں ہیں، جہاں ۲۰۱۱ء کے اوائل میں عوامی مظاہروں نے حسنی مبارک کے تین دہائیوں پر پھیلے ہوئے طویل آمرانہ دور حکومت کا خاتمہ کر دیا

تھا۔ تیونس کا انقلاب ہو یا بعد میں وقوع پذیر ہونے والے مصر اور لیبیا کے عوامی انقلابات عام طور پر ان کے بارے میں یہ تأثر دیا گیا کہ یہ عوامی بے روزگاری اور ملکی اقتصادی بدحالی کا نتیجہ تھے۔ مغربی نام نہاد مفکرین سے لے کر ان کے مقامی آلہ کاروں تک ایک بہت بڑی تعداد ایسی تھی جو ان انقلابات کے اسباب وعوامل اقتصادی بدحالی اور عوامی بے روزگاری یہاں تک کہ جنسی عدم آسودگی میں تلاش کرتی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ اقتصادی بدحالی اور بے روزگاری بھی من جملہ عوامل میں شامل تھے، لیکن یہ اصل عامل ہرگز نہیں تھے۔ اس میں عربوں کی روایتی غیرت اور عزت نفس کے ساتھ ساتھ اسلام سب سے بنیادی عنصر کے طور پر شامل تھا، اور ہے۔ خاص طور پر مصر کے حوالے سے یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حسنی مبارک کے اقتدار کو اکھاڑنے میں مصر کا مذہبی طبقہ سب سے زیادہ پیش پیش تھا، خصوصاً اخوان المسلمون سب سے آگے تھی۔ حسنی مبارک کے خلاف ہونے والے مظاہروں کی تنظیم جس پیمانے کی تھی اور جس طرح عین مظاہروں کے دوران نوجوان نماز کے لیے صف بستہ نظر آتے تھے، ان کو دیکھنے کے بعد اس بات میں کوئی وزن محسوس نہیں ہوتا کہ یہ مظاہرے اچانک اور بے قیادت تھے۔

حسنی مبارک کی اقتدار سے بے دخلی سے لے کر پارلیمانی اور صدارتی انتخابات تک معاملات کو جس طرح طول دیا گیا، اور جس طرح مختلف بہانوں سے چیزیں مؤخر کی جاتی رہیں، ان سب کا مقصد یہی تھا کہ کسی طرح مصر میں اسلام پسندوں خاص طور پر اخوان کو اقتدار سے دور رکھا جائے۔ اس دوران سب سے پہلے تو اس بات کی کوشش کی گئی کہ مصر میں انقلاب پر اسلام پسندی کا لیبل نہ لگنے پائے۔ اس کے بعد یہ کوشش کی گئی کہ حسنی مبارک کے بعد کے مصر میں ایک ایسی لبرل اور سیکولر قیادت تلاش اور تیار کی جائے جو حسنی مبارک کے بعد بھی مصر میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مفادات کی نگراں ونگہبان ہو۔ اس پر بس نہیں کیا گیا بلکہ مصر میں اسلام پسند طبقے کو تقسیم کرنے کے لیے سلفی پارٹی 'النور' کو کھڑا کیا گیا، اور جو لوگ مصر کی عوامی زندگی میں کوئی وجود ہی نہیں رکھتے تھے انہیں ایک خاص عرب ملک کی حمایت اور سرمایے کے ذریعہ ایک بڑی سیاسی قوت کے طور پر کھڑا کر دیا گیا۔

بعد کے حالات میں مصر میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا، یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، لیکن سی آئی اے اور موساد کے ذریعہ جس طرح مصر کے پہلے جمہوری طور پر منتخب اسلام پسند صدر کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی سازش رچی گئی، اس پر سے پردہ اٹھنے میں شائد ساٹھ برس کا عرصہ لگ جائے۔ ابھی حال ہی میں سی آئی اے کی جو دستاویزات منظر عام پر آئی ہیں، ان سے پوری طرح یہ صاف ہوگیا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں ایران کے منتخب اور مقبول وزیر اعظم 'مصدق' کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش سی آئی اے نے رچی تھی، لیکن قرائن اور بعد کے حالات سے جو کچھ

سامنے آیا ہے وہ یہ کہ 'تمرد' کے نام سے جو تحریک منتخب صدر مرسی کے خلاف کھڑی کی گئی وہ فوج اور مغرب کے دوسرے آلہ کاروں کی کھڑی کی ہوئی تھی۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ مصر کے وہ نوجوان جو اقتصادی حالات کی اصلاح کے سلسلے میں اپنے وعدے نہ پورے کرنے پر صدر مرسی کے خلاف میدان میں اتر آئے تھے، وہ اس بڑے پیانے پر خون خرابے اور عوامی سرمایے کو فوج کو تحفۃً کے طور پر دینے پر احتجاج کرنے کے لیے سامنے نہیں آتے۔ فوج، عدلیہ، انتظامیہ، اپوزیشن، یہاں تک کہ سلفی پارٹی 'النور' سب نے مل کر جس طرح اخوان المسلمون، اس کے سیاسی بازو جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی اور صدر مرسی کے خلاف محاذ آرائی کی اور پھر تختہ پلٹنے والوں کا نہ صرف ساتھ دیا، بلکہ ان کے آلہ کار کے طور پر کام کیا۔ وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مغرب اور اس کے اتحادیوں کو عالم اسلام میں سب کچھ برداشت ہوسکتا ہے، لیکن اس کی بنیاد پر قائم ہونے والا کوئی بھی نظام اس کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔

بہت سے لوگوں کی جانب سے ایسی باتیں بھی آرہی ہیں اور بظاہر یہ اخوان کی ہمدردی کے تناظر میں کہی جاتی ہیں، لیکن فی الحقیقت یہ اس نمک خوری کا حق ہے جو اسلامی نظام کی مخالف عرب حکومتوں کی جانب سے انہیں ملتا ہے، کہ اخوان کی قیادت نے احتیاط اور مصلحت سے کام نہیں لیا، انہیں اپنے اقدامات اور فیصلوں میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے تھا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو شائد حالات وہ نہ ہوتے جو کہ آج ہیں۔ جس کسی نے بھی حسنی مبارک کے بعد کے مصر کے حالات پر تھوڑی بہت نظر رکھی ہے، وہ اس سے اتفاق کرے گا کہ اخوان اور ان کی قیادت نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا جسے جلد بازی یا مصلحت کے خلاف قرار دیا جائے۔ اکثریت مل جانے کے باوجود انہوں نے انتظامیہ، عدلیہ، یا فوج میں کہیں بھی کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی، اور شائد وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں تھے بھی نہیں۔ پچھلے ساٹھ برسوں سے اخوان جس طرح کے حالات کا سامنا کرتے رہے ہیں، اس کی وجہ سے ان کے پاس اتنی بڑی تعداد میں افراد کار ہی نہیں ہیں کہ وہ بڑے پیانے پر تبدیلیاں کرپاتے۔ فوج، عدلیہ اور انتظامیہ سب اپنی جگہ برقرار رہی، یہاں تک کہ فوج کے بجٹ میں مرسی کی حکومت نے اضافہ بھی کیا۔ چند کو چھوڑ کر وزارتیں بھی زیادہ تر غیر اخوانیوں کو دی گئیں۔ ہاں مرسی یا ان کی جماعت اس بات کی قصوروار ضرور قرار پاتی ہے کہ وہ گلے گلے تک کرپشن میں ڈوبے مصر میں شفافیت لانا چاہتے تھے۔ شائد یہی وہ بنیادی وجہ تھی جس کی وجہ سے مصر کے دشمنوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ فوج اور دیگر اداروں کو مرسی کی حکومت کے خلاف استعمال کریں، اور اس میں انہیں کامیابی بھی مل گئی۔

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

تجزیہ

مصر کا موجودہ سیاسی بحران

چند حقائق کا جائزہ

ابوالاعلی سید سبحانی

۳؍جولائی ۲۰۱۳ء کو مصر میں جو تبدیلی آئی وہ ایک فوجی بغاوت تھی، جس کے پس پشت کئی ایک خارجی وداخلی سازشیں کارفرما تھیں۔

ایک منتخب جمہوری حکومت کے خلاف فوجی بغاوت مصری عوام کے لیے بالکل ہی ناقابل برداشت واقعہ تھا۔اس واقعہ نے مصری عوام کے جذبات پر بہت سخت چوٹ کی۔سالہاسال کی آمریت اور تاناشاہی کے بعد عوام کو پہلی دفعہ اپنی رائے اور اپنے اختیار سے حکومت منتخب کرنے کا موقع ہاتھ آیا تھا،اور اس منتخب حکومت پر بمشکل ایک ہی سال گزرا تھا کہ اس پر دشمنوں نے شب خون مار کر ملک کو ایک شدید بحران کا شکار بنادیا۔

بے مثال عوامی ردعمل

اس انقلاب کی خبر سنتے ہی عوام کا ایک زبردست ہجوم سڑکوں پر نکل آیا،جس کی تعداد بعض مواقع پر کئی کئی کروڑ بیان کی گئی۔لاکھوں افراد دن رات مختلف میدانوں میں مستقل طور پر قیام کرنے لگے،وہیں نماز پنجگانہ ادا کرتے،تراویح کی نمازیں ہوتیں اور قیام لیل میں اللہ رب العزت سے مناجات کرتے۔

منتخب جمہوری صدر کی واپسی کے لیے منعقد ہونے والے اس احتجاجی مظاہرے میں مسلم علماء بھی شریک تھے اور مسلم عوام بھی۔ملک کے ہر علاقے اور ہر طبقے کے لوگ اس میں شریک تھے،خواص بھی تھے، اور عوام بھی۔یہ مظاہرے آج دوماہ کی مدت گزرجانے کے بعد بھی اسی عزم اور حوصلے کے ساتھ جاری ہیں۔

اپنے منتخب صدر کی واپسی کے لیے نکلنے والے ان مظاہرین نے حد درجہ دانشمندی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اپنے احتجاج اور مظاہروں کو پرامن شکل میں جاری رکھا۔صرف یہی نہیں کہ انہوں نے بہت ہی پرامن انداز میں اپنے مظاہرے جاری رکھے، بلکہ دن رات مستقل مظاہروں پر بیٹھنے والے اپنے ساتھیوں کے لیے ہر طرح کے انتظامات بھی کیے۔لائٹ کٹی تو اس کا انتظام کیا۔پانی کاٹا گیا تو اس

کا انتظام کیا گیا۔ میڈیا نے ساتھ نہیں دیا تو اپنے سوشل نیٹ ورک کا استعمال کیا گیا۔ اصلی جہاز نہیں ملے تو کھلونے والے جہازوں کو اڑا کر کام چلایا گیا۔ غرض انتہا درجہ کی ہمت، حوصلے اور ثبات قدمی کے ساتھ زبردست مظاہرے منعقد کیے گئے۔

اس موقع پر اُن کے قائدین نے بھی اپنی قیادت کا لوہا منوالیا، اتنے بڑے ہجوم کو اس قدر منظّم انداز میں لے کر چلنا، اور حکومت کی جانب سے خطرناک قسم کی پرتشدد کارروائیوں کے باوجود کسی قسم کے پرتشدد ردعمل سے انہیں باز رکھنا، یہ اسی قیادت کا کمال تھا۔

عوام کی اس پرامن جدوجہد کی بجائے اس کے کہ عالمی سطح پر تحسین کی جاتی، اس کے خلاف طرح طرح سے سازشیں کی گئیں، اور اس کو توڑنے اور ختم کرنے کے لیے عالمی طاقتوں کی نگرانی میں فوجی حکومت کی جانب سے زبردست آپریشن کیے گئے، ابتدا میں شہیدوں کی تعداد سینکڑوں میں بیان کی جارہی تھی، دھیرے دھیرے یہ تعداد بڑھتی رہی اور بالآخر یہ تعداد ہزاروں تک جا پہنچی، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود عوام نے تشدد کی راہ اختیار کرنے سے صاف انکار کردیا۔

پرامن مظاہرین پر ان جارحانہ کارروائیوں کے لیے طرح طرح سے جواز تلاش کیے گئے، کبھی ان پر الزام عائد کیا گیا کہ ان کی جانب سے فوج پر اقدامی حملہ ہوا تھا، جس میں جواباً فوج کی جانب سے فائرنگ کی گئی، کبھی کوئی دوسرا الزام عائد کیا گیا، اور بالآخر اپنے ہی ملک کی حکومت نے اپنے ہی ملک کی کروڑوں عوام کو دہشت گرد اور جہادی قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف اندھادھند کارروائیاں شروع کردیں، جس میں لاکھوں افراد زخمی اور ہزاروں افراد شہید ہوئے۔

یہ دنیا کا پہلا قتل عام تھا، جس کو پوری دنیا نے براہ راست دیکھا، ٹی وی چینلس پر اس کو لائیو دکھایا گیا، لیکن پورا دن گزر جانے کے بعد بھی زمین وآسمان گواہ ہیں کہ کوئی بھی قابل ذکر عالمی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ حقوق انسانی کے علمبرداروں، جمہوریت اور جمہوری اقدار کا نعرہ بلند کرنے والوں، اور مسلم امت کی قیادت کا دعوی کرنے والوں نے اس حادثہ پر انتہا درجہ کی مجرمانہ خاموشی اختیار کی۔ ایک خلیجی مملکت کے حکمراں نے تو تمام حدود پار کرتے ہوئے اس موقع پر اپنے ایک انتہائی جارحانہ بیان (مصر کی دہشت گردی مخالف مہم میں ہم فوجی حکومت کے ساتھ ہیں) میں اس بات کا صاف اعلان کردیا کہ ابھی بھی اس کی پیاس نہیں بجھ سکی ہے، اسے مزید کی طلب ہے۔

تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس قدر جارحانہ کارروائیوں کے باوجود، جبکہ اندھادھند گرفتاریوں اور قتل عام کا سلسلہ جاری ہے، عوام آج بھی زبردست ثبات قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سڑکوں پر احتجاج کررہے ہیں۔ مظاہرے بھی جاری ہیں، اور ان کے خلاف جارحانہ کارروائیاں بھی جاری ہیں۔

حقائق کا تجزیہ

مصر کی ایک منتخب جمہوری حکومت پر شب خون کے بعد جس طرح عالمی ردعمل سامنے آیا، اور جیسے جیسے تبدیلیاں سامنے آ رہی ہیں، اس پورے واقعہ کا بے لاگ تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں جو کچھ ہوا؛

(۱) وہ ایک صہیونی سازش تھی۔

(۲) جس میں امریکہ نے بہت ہی نمایاں اور خطرناک کردار ادا کیا۔

(۳) اور بعض خلیجی ممالک کے ظالم حکمرانوں نے اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے مغربی آقاؤں کے اشارے پر اس سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر ممکن تعاون پیش کیا۔

(۴) اس کے لیے مصر کے اندر فوج اور اپوزیشن پارٹیوں کو استعمال کیا گیا۔

(۵) اور مصر کے باہر رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے مغربی میڈیا نے ہر ممکن بددیانتی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے حقائق کو مسخ کرنے کا کام کیا۔

اس مضمون میں مذکورہ بالا نکات پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی؛

(۱) صہیونی سازش

اسرائیل کے ایک بڑے تجزیہ نگار 'ڈان مارگالٹ' نے مصر کی موجودہ صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اگر ہم اس انقلاب کو ناکام ہونے کی اجازت دے دیتے ہیں، اور اخوان حکومت میں واپس آ جاتے ہیں تو ہماری نسلیں خون کے آنسو روئیں گی، اب اسرائیل کے لیے ناگزیر ہوگا کہ اس کے وقوع کو ناکام بنائے اور اس کی ضمانت لے، کیونکہ اخوان جلد ہی اسرائیل سے کسی بھی صورت انتقام لیں گے"۔(اسرائیل ٹوڈے)

اسرائیلی تجزیہ نگار کے اس بیان پر حیرت اور تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، اسرائیل کو اس بات کا خوب اندازہ ہے کہ خطے میں اگر کوئی حکومت اس کے سامنے ٹک سکتی ہے، تو وہ اخوان ہی ہیں۔ عرب دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جس وقت بڑی بڑی عرب حکومتیں اسرائیل کے سامنے پسپائی اختیار کر گئی تھیں، اس وقت اخوانی ہی عرب دنیا کی وہ واحد فوج تھے جس نے اسرائیل کو ناکوں چنے چبانے پر مجبور کر دیا تھا، یہاں تک کہ عالمی طاقتوں کو مداخلت کر کے جنگ بندی کرانی پڑی تھی۔ حال ہی میں اسرائیل کے ایک بڑے تحقیقی ادارے نے بھی اپنی رپورٹ میں یہی بات کہی ہے کہ اس وقت اسرائیل کے لیے سب سے بڑا خطرہ اخوان المسلمون ہیں۔

اسرائیل جس عظیم یہودی سلطنت کا قیام عمل میں لانا چاہتا ہے، اس کے نقشے میں مصر کا بھی ایک

حصہ شامل ہے، اور اس پورے خطے میں یہی ایک ایسا ملک ہے جس سے اسرائیل نے ہمیشہ سے خطرہ محسوس کیا ہے، اور اس خطرے کا بڑا سبب یہی اندیشہ رہا ہے کہ کہیں اخوان یہاں برسراقتدار نہ آجائیں، کیونکہ اخوان کا برسراقتدار آجانا، اور ایک مضبوط سیاسی پوزیشن اختیار کر لینا، اور مصر میں ایک آزاد جمہوری حکومت کی تشکیل میں کامیابی حاصل کر لینا اسرائیل کے مستقبل، یا کم از کم خطے میں اس کی غنڈہ گردی کے سامنے ایک بہت بڑا چیلنج بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل اور اس کے حلیف مغربی ممالک جن میں امریکہ سرفہرست ہے، وہ کبھی اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ مصر میں اخوان یا کسی بھی آزاد منتخب جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آجائے۔ وہ یہی چاہتے ہیں کہ دیگر مسلم اور عرب ممالک کی حکومتوں کی طرح مصر میں بھی ان کے غلام ہی اقتدار پر قابض رہیں۔ اس کے لیے ان طاقتوں نے عوام اور ان کے جذبات کا خون کرتے ہوئے کبھی جمال عبدالناصر کو آگے بڑھایا، کبھی انور سادات کو، اور کبھی حسنی مبارک کو، اور اس وقت غلاموں کی ایک پوری ٹیم کو استعمال کیا جا رہا ہے، جس نے مرسی حکومت یا مصری عوام کے خلاف بہت ہی خطرناک اور مہلک سازشوں کو عملی جامہ پہنانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

اسرائیل کے اس موقف کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ گزشتہ ساٹھ سالہ مصری تاریخ کا جائزہ لیا جائے کہ اس دوران مصر کی مختلف حکومتیں کس طرح اسرائیل کے مفاد اور اس کی مصلحت کے لیے کام کرتی رہی ہیں، اور کس طرح اسرائیل کے محض ایک اشارہ پر اِن حکومتوں نے کھلے عام اپنے ملک کے اسلام پسند شہریوں اور پڑوسی ملک فلسطین کے معصوم اور نہتے آزادی پسند عوام کا قتل وخون کیا ہے، یا ان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اخوان یا مرسی حکومت کے خلاف اسرائیل نے جو سازشیں رچی ہیں، ان سازشوں کے علاوہ اس کے سامنے اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ اخوان کی سب سے بڑی 'کمزوری' یہ ہے کہ اس کے قائدین اور وابستگان ملک وملت کے لیے بہت ہی مضبوط اور بہت ہی سچے ثابت ہوئے ہیں، انہیں اللہ رب العزت کے سوا کسی اور کا خوف نہیں ہوتا، وہ اللہ رب العزت کی رزاقیت کے سوا کسی اور پر ایمان نہیں رکھتے، چنانچہ مغربی اور اسلام دشمن دنیا ساری کوششوں کے بعد بھی اس کے قائدین کی قیمت لگانے میں ناکام رہ جاتی ہے، والحمدللہ علی ذلک۔ مصر میں بھی اس کی بہت کوشش کی گئی، اسلام پسند حکمراں محمد مرسی اور ان کی پارٹی اور جماعت کے بڑے بڑے لیڈروں کو خریدنے کی کوشش ہوئی، نہیں مانے تو ڈرایا دھمکایا گیا، لیکن اس طرح کی کوئی بھی چال ان کے سامنے کامیاب نہیں ہوسکی۔ اب دشمنوں کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ کھل کر ان کے خلاف محاذ آرائی کریں، یا ان کی حکومت کو تسلیم کر کے اپنے مستقبل اور مستقبل کے منصوبوں کو خطرے میں ڈال دیں۔ مصر کے حالات کا بے لاگ تجزیہ کرنے سے یہی حقیقت

کھل کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ اسرائیل نے یہی کیا، فوجی بغاوت سے دو دن قبل 'تل ابیب یونیورسٹی' کے ایک پروفیسر 'لیوی' نے اسرائیلی ٹیلی ویژن پر ایک بحث کے دوران کہا کہ اسرائیل مصر میں انقلابی جدوجہد کو تقویت پہنچانے میں سنجیدہ ہے اور وہ غزہ کی طرح یہاں اپنی غلطی دہرانے والا نہیں ہے۔ یہی ہوا، اسرائیل نے اس فوجی انقلاب کی کھل کر پشت پناہی کی، اور اب یہ حقائق سامنے آچکے ہیں کہ سیسی نے بغاوت سے تین روز قبل اسرائیل کو انقلاب کی خبر دے دی تھی، اور اس کے ساتھ ہی اسرائیلی سفیر نے اپنے سفارتی عملے کے ساتھ قاہرہ چھوڑ دیا تھا۔ فوج کی جانب سے بغاوت کرانے کے بعد وہ کھل کر سامنے بھی آگیا، جس دن مرسی حکومت کے خلاف فوجی بغاوت کا اعلان کیا گیا، اُس دن اسرائیل میں جشن منائے گئے، اور اسرائیلی روزناموں نے سیسی کو مصر کے اندر اسرائیلی ہیرو بنا کر پیش کیا۔

اب جیسے جیسے دن گزرتے جارہے ہیں فوجی حکومت اور اسرائیل کے درمیان موجود گہرے روابط بھی سامنے آتے جارہے ہیں۔

فوج کی جانب سے تشکیل کردہ حکومت کے نائب صدر البرادعی (جو اَب بظاہر حکومت سے الگ ہوگئے ہیں) نے اپنے ایک بڑے فوجی جنرل کے ساتھ اپنا پہلا خفیہ سیاسی دورہ اسرائیل کا کیا۔ اس کے بعد ہی مصر کی کسی حکومت نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنے ہی عوام کی سرکوبی کے لیے سینائی علاقے میں اسرائیل سے فوجی مدد کی درخواست کی، جس کے نتیجے میں چند دن بعد ایک اسرائیلی طیارے نے اس علاقے پر حملہ کرکے کئی نوجوانوں کو شہید کردیا، اور ضرورت پڑنے پر مزید فوجی مدد کی یقین دہانی کرائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اسرائیل مکمل طور سے اپنے ہتھیاروں اور اپنی سازشوں کے ذریعہ مصر کی باغی حکومت کی مدد کررہا ہے، اور یہ حقیقت دنیا کے سامنے آچکی ہے کہ میدان رابعہ اور پورے ملک میں مظاہرین کے اوپر ہونے والی جارحانہ کارروائیوں میں جن ہتھیاروں کا استعمال کیا جارہا ہے، ان میں سے بعض مہلک ہتھیار اسرائیل سے حاصل کیے گئے ہیں۔

(۲) امریکہ کا خطرناک چہرہ بے نقاب

مصر اس خطے میں امریکہ کا ایک بہت ہی زبردست مارکیٹ تھا، اور پورے عالم اسلام پر اثرانداز ہونے کا ایک بہترین راستہ تھا، اور جدید دور کی مصری تاریخ بتاتی ہے کہ اب تک وہاں کے حکمراں امریکی مفاد میں ہی کام کرتے آئے تھے۔ اس کے علاوہ مصری فوج کی ٹریننگ بھی امریکہ میں ہوتی تھی۔ مصر کی تجارت اور معیشت پر امریکہ کا قبضہ تھا۔ مصر کی سیاسی پالیسیاں امریکی اشاروں پر تیار ہوتی تھیں۔ تاہم گزشتہ سال مرسی کے اقتدار میں آجانے کے بعد امریکہ کو محسوس ہوا کہ مصر سے اس کا اثر ورسوخ ختم ہوا جارہا ہے، اور یہ حکومت جس تیزی کے ساتھ کامیابی کی طرف گامزن ہے، اگر کچھ اور وقت باقی رہ گئی تو

پھر دھیرے دھیرے اس کے اثرات پورے عالم عرب اور عالم اسلام تک پھیل جائیں گے، اور یہ چیز خطے میں صہیونی عزائم (جس کے لیے ہمیشہ سے امریکہ نے راہیں ہموار کی ہیں) اور خود امریکی مفادات کے لیے بہت ہی خطرناک چیلنج ثابت ہوگی۔

اس وقت ترکی، تیونس اور مصر کے خلاف جس طرح سازشوں کا جال تیار کیا جا رہا ہے، اس کے پیچھے دراصل یہی عزائم کارفرما ہیں۔ ترکی اور تیونس میں گرچہ ابھی یہ سازشیں کامیاب نہیں ہوسکی ہیں، لیکن اگر مصر میں انہیں کامیابی مل جاتی ہے تو کوئی بعید نہیں کہ اگلا محاذ اور دیدہ دلیری کے ساتھ سر کیا جائے۔

امریکی حکومت کا اس دوران جو رویہ سامنا آیا وہ بہت ہی گھناؤنا، اور افسوسناک ہے۔ امریکی صدر اوبامہ نے اس دوران جو بیانات دیئے ہیں وہ خود حقیقت واقعہ بتانے کے لیے کافی ہیں، امریکی صدر نے اپنے ایک بیان میں مصر میں ہوئی فوجی بغاوت کو فوجی انقلاب ماننے سے انکار کرتے ہوئے اسے امریکہ کے قومی مفاد میں درست قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد بلتاجی حزب الحریہ والعدالہ کے بڑے قائدین میں شمار ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ قاہرہ میں مقیم امریکی سفیر نے ایک خلیجی وزیر خارجہ کے ساتھ مرسی سے ملاقات کی تھی، اور ان سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اقتدار چھوڑ دیں یا محض علامتی طور پر باقی رہیں اور سارا اقتدار ایک نئے وزیر اعظم کے حوالے کردیں، اور پارلیمنٹ اور دستور کی معطّلی پر راضی ہوجائیں۔ مرسی نے جب اس کو ماننے سے صاف انکار کردیا تو امریکی سفیر نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ نہیں مانے تو بزور قوت معزول کیا جائے گا۔

اس موقع پر امریکی صدر اوبامہ کا چہرہ بھی کھل کر سامنے آگیا، وہ ایک طرف مسلم حکومتوں کے ساتھ امن و یکجہتی اور تعلقات استوار کرنے کی باتیں کرتا ہے، اور دوسری جانب اس کی یہ پالیسی ہے کہ کسی بھی طرح مسلم ممالک میں استقرار اور استحکام نہ آنے پائے۔ اسی طرح اس موقع پر مغربی دنیا کے ان نام نہاد جمہوریت کے ٹھیکیداروں کا حقیقی چہرہ بھی سامنے آگیا کہ وہ کس قدر جمہوریت اور جمہوری اقدار کے سلسلے میں سچے اور مخلص ہیں، ان کے یہاں حقوق انسانی کا کیا مفہوم پایا جاتا ہے، اور وہ انسانی عظمت کی پاسداری کے جو بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، ان کی کیا حقیقت ہے۔ بہرحال اس موقع پر صرف امریکہ ہی نہیں بلکہ پوری مغربی دنیا کا حقیقی چہرہ سامنے آگیا کہ وہ اپنے تمام تر سیاسی اور جمہوری نعروں کے باوجود کتنی جھوٹی اور مفاد پرست ثابت ہوئی ہے۔

امریکہ نے اس موقع پر مصر میں جو کھیل کھیلا، اس میں جہاں اس کی اسلام دشمن اور اسرائیل نواز پالیسیوں کا دخل تھا، وہیں اس کے اپنے معاشی اور سیاسی مفاد کا مسئلہ بھی تھا۔ ماضی قریب کی عالمی تاریخ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ نے مختلف ممالک میں، جو اس کی دی گئی لائن سے ذرا بھی ہٹے

ہیں، خواہ مسلم ہوں یا عیسائی، فوجی بغاوت یا عوامی انقلاب کے ذریعہ حکومتوں کا تختہ پلٹنے یا وہاں عدم استقرار پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ایران میں 'محمد مصدق' اور پھر 'شاہ' نے جب امریکی پالیسی سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی تو ان کے خلاف جس طرح فوجی اور خمینی انقلاب آئے، اس کا بے لاگ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ (محمد مصدق کے خلاف ۱۹۵۳ء میں ہونے والی فوجی بغاوت کے سلسلے میں اب یہ حقائق کھل کر سامنے آچکے ہیں کہ وہ امریکہ کی سازش تھی، البتہ خمینی انقلاب کے سلسلے میں بعض عرب مفکرین جن میں علامہ محمد احمد راشد سرفہرست ہیں ان کا ماننا ہے کہ حقائق کی روشنی میں بے لاگ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خمینی انقلاب دراصل شاہ کی مغرب مخالف پالیسیوں کے خلاف امریکی اور فرانسیسی پروپیگنڈے اور سازشوں کا نتیجہ تھا، جس کے لیے اس وقت فرانس میں مقیم امام خمینی کو استعمال کیا گیا۔ ملاحظہ ہو: الردۃ عن الحریۃ للعلامۃ محمد احمد راشد)۔ اسی طرح ۲۰۰۲ء میں وینزویلا میں جب شاویز نے ایک آزاد اور خود مختار حکومت چلانے کا عزم کیا، اُس وقت اُس کے خلاف جس طرح سازشیں رچی گئیں، اور اس میں امریکہ نے جو کلیدی کردار ادا کیا، فوجی انقلاب کی ناکامی یا عوامی مظاہروں کے سامنے فوج کی پسپائی کے نتیجے یہ تمام حقائق کھل کر سامنے آگئے۔ اس امر کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کس طرح امریکہ اور اسرائیل نے مل کر گزشتہ دہائیوں میں مختلف حکومتوں کے خلاف فوجی یا عوامی بغاوت کرائی ہے، اور اس کے پیچھے ان کے کیا مصالح کارفرما تھے، اور اس مقصد کے لیے کن کن عناصر کو انہوں نے استعمال کیا ہے۔

(۳) بعض خلیجی مملکتوں کا افسوسناک رویہ

اس موقع پر بعض خلیجی مملکتوں کا جو رویہ کھل کر سامنے آیا ہے، وہ بہت ہی افسوسناک ہے۔ ان ممالک کے حکمرانوں نے نہ صرف یہ کہ آگے بڑھ کر فوجی بغاوت کی تائید میں بیان جاری کیے، بلکہ فوجی حکومت کو زبردست مالی تعاون بھی پیش کیا۔

خلیج کے ان ممالک کے ساتھ ایک مسئلہ مشترک ہے، اور وہ ہے اپنے مستقبل کا تحفظ، جس کا جھانسہ دلا کر مغربی اور استعماری طاقتیں جو چاہتی ہیں ان ممالک کی حکومتوں سے منوالیا کرتی ہیں۔ خلیج کے ممالک میں اس وقت بادشاہی نظام پایا جاتا ہے، جس میں حکومت کی پالیسیاں، عدالتی نظام، اور تمام ہی حکومتی اداروں پر مخصوص خاندان اور افراد کا تسلط ہوتا ہے، اور ملک کے عوام کا ملک کی سیاست میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔ جدید دنیا میں جبکہ آزادی اور انسانی حقوق کی بحث اپنے وسیع معنوں میں پوری دنیا میں متعارف ہو چکی ہے اور انسانی ذہن نے اس کو نہ صرف قبول کرلیا ہے، بلکہ اس کے حصول کے لیے سرگرم بھی ہے۔ ایسے حالات میں اس قسم کے نظام کو لے کر چلنا آسان نہیں ہے، جہاں ملک کے عوام کی کوئی حیثیت نہ ہو،

ان کے کوئی حقوق نہ ہوں، ملک کی سیاست اور ملک کی تعمیر وترقی میں ان کا کوئی کردار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان مملکتوں نے ہمیشہ مغرب کا یا عالمی استعمار کا سہارا لیا ہے، اور مغربی طاقتوں نے اپنے وسیع تر مفادات کے لیے ان کی پشت پناہی کی ہے، اور ان کا خوب خوب سیاسی اور معاشی استحصال کیا ہے۔ مصر کے سلسلے میں خلیجی مملکتوں کے رویے کا جائزہ لینے سے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

جدید دور کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ جہاں مغرب اپنے یہاں جمہوریت اور جمہوری اقدار کے فروغ کی باتیں کرتا ہے، وہیں وہ اِس چیز کو عرب ممالک یا مسلم دنیا کے لیے کسی بھی صورت پسند نہیں کرتا۔ یہاں وہ بہت ہی جھوٹا اور مفاد پرست ثابت ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ مسلم دنیا کے ممالک میں بادشاہت اور تاناشاہی قائم رہے اور ان ممالک کے عوام مکمل طور سے اپنے جمہوری اور بنیادی انسانی حقوق سے محروم رہیں، کیونکہ یہی چیز اس پورے خطے میں مغرب کے مفاد میں ہے، چنانچہ اس خطے میں جب بھی ایک آزاد جمہوری حکومت کے قیام کے امکانات نظر آتے ہیں، فوراً ہی اس کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ مصر میں بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا، ڈاکٹر مرسی مصر کو ایک آزاد اور خودمختار جمہوریہ بنانا چاہتے تھے، اور ان کا ایک سالہ دورِ حکومت اس بات کا صاف اشارہ دے رہا تھا کہ اگر مرسی پانچ سال تک حکومت قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو مصر کا نقشہ تبدیل ہو جائے گا۔ اس بات کو امریکہ اور اسرائیل کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے اس کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا، اور ان کے حلیف خلیجی ممالک نے اپنے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لیے اس میں بھرپور تعاون پیش کیا۔

اس کے علاوہ بھی خلیجی مملکتوں کے رویے کے سلسلے مختلف تجزیے سامنے آرہے ہیں، جس میں خلیجی مملکتوں کے اس موقف کے اسباب پر گفتگو کی گئی ہے، تاہم ان اسباب کی حیثیت جزوی ہے۔ ایک خلیجی مملکت کے موقف کے سلسلے میں یہ تجزیہ سامنے آیا، جس کی تائید وہاں کے صدر مملکت کی جانب سے قاہرہ میں موجود سفارت خانے کو ارسال کئے گئے خط سے بھی ہوتی ہے کہ مصر میں ایک اسلام پسند اخوانی حکمراں کی کامیابی کے نتیجے میں اسے اندیشہ ہے کہ عالم اسلام کی مذہبی قیادت ہاتھ سے نہ چلی جائے۔ اس کا ماننا ہے کہ اگر اسی طرح اخوانی آگے بڑھتے چلے گئے تو وہ وقت دور نہیں کہ ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں بچے گا۔ گرچہ یہ تجزیہ ایک حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے، لیکن اس کو حقیقی سبب نہیں کہا جاسکتا۔ مصر میں ہونے والے اس واقعہ کے بعد اب اس بات کی امید کرنا کہ سارا عالمِ اسلام محض چند جذباتی مسائل کو لے کر کسی مذہبی قیادت کو تسلیم کر لے گا، بہت آسان نہیں ہے، اس وقت پورے عالم اسلام میں مغرب نواز خلیجی مملکتوں کے اسلام مخالف رویے کے خلاف نفرت کی ایک لہر چل پڑی ہے۔

خلیج کے یہ حکمراں بجائے اس کے کہ حالات کا صحیح طور سے جائزہ لیتے اور اپنے موقف پر نظرثانی

کرتے، دن بہ دن ان کا موقف سنگین ترین صورتحال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ابھی تازہ بیان میں ایک خلیجی حکمراں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ وہ دہشت گردی مخالف جنگ میں مصری حکومت کے ساتھ ہے۔ اس بیان کے بعد اس حکمراں کے خلاف نفرت کا رجحان اور زیادہ عام ہوا ہے، اس کی اپنی مملکت میں بھی اس کے خلاف سخت نفرت اور بے چینی پائی جاتی ہے، قارئین یہ سن کر تعجب کریں گے کہ وہاں کے کچھ نوجوانوں نے ابھی فیس بک پر اپنی ظالم حکومت کے خلاف ایک مہم شروع کی تھی، جس میں حصہ لینے والوں کی تعداد چند دن میں ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔ فی الواقع ایک زمانے کے بعد اس قسم کا ماحول پروان چڑھ رہا ہے، اور اللہ نے چاہا تو وہ دن دور نہیں جب تیونس سے شروع ہونے والی عرب بہار پوری مسلم دنیا میں نظر آئے گی۔

متحدہ عرب امارات کے موقف کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اس نے اخوان کے تعلق سے اس قدر شدید رویہ اختیار کیا ہے، حالانکہ امارات کا نہ تو خطے کی سیاست میں کوئی بڑا کردار ہے اور نہ ہی وہاں اسلام پسند اس قدر مضبوط ہیں کہ وہاں ابھی کسی انقلاب کی امید کی جا سکتی ہو جس سے ان کو اندیشہ ہو اور اس سلسلے میں احتیاط کے طور پر اس نے یہ رویہ اختیار کیا ہو۔ امارات کے اس موقف کا کیا سبب ہے اس کے تعلق سے معروف عرب مفکر علامہ محمد احمد راشد نے اپنی کتاب 'الردۃ عن الحریۃ' میں نوم چومسکی کے حوالے سے ایک بہت ہی زبردست بات نقل کی ہے، جس سے اس پروپیگنڈے کی بھی نفی ہو جاتی ہے کہ مصر میں معاشی صورتحال انتہا درجہ بحران کی شکار تھی، نوم چومسکی نے لکھا ہے کہ مرسی نے اپنے ایک سالہ دور میں جس طرح مصر کی معیشت کو کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے جس طرح نئے نئے منصوبے بنائے ہیں، اور اتنی کم مدت میں اس کے جو زبردست نتائج سامنے آئے ہیں، اس سے امارات کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ مسلم دنیا میں اس کو جو معاشی برتری حاصل ہے، اس پر کہیں مصر قبضہ نہ کر لے۔ چنانچہ نہر سوئز پر مرسی نے جو پلان بنایا تھا، جس سے تقریبا دس لاکھ افراد کو روزگار ملنے والا تھا، اور جس سے مصری حکومت کا زبردست مالی فائدہ ہونے جا رہا تھا، فوجی بغاوت کے بعد اس کو منسوخ کرانے کے لیے امارات نے مصر کی فوجی حکومت کو کئی کروڑ ڈالر کی رشوت سر عام دی ہے، اور مصر کی باغی حکومت نے اس منصوبہ کو روکنے پر حامی بھی بھر لی ہے۔

حقیقت میں ان خلیجی مملکتوں کو امریکہ نے طرح طرح سے جھانسہ دلاتے ہوئے اور ان کا استحصال کرتے ہوئے اس فوجی بغاوت میں نہ صرف شریک کیا، بلکہ ان کو بالکل ننگا کر کے چھوڑ دیا، اس موقع پر وہ تمام افراد، مملکتیں اور جماعتیں جن کی منافقت پر زمانے سے پردہ پڑا ہوا تھا، کھل کر سامنے آگئیں۔

(٤) داخلی سازشیں

صدر محمد مرسی کے خلاف ہونے والی ان سازشوں میں مصر کے اندر بنیادی طور پر چار عناصر کو استعمال کیا

گیا،جس میں میڈیا سرفہرست ہے،میڈیا نے مرسی حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں زبردست کردار ادا کیا،اس پروپیگنڈے سے مصر کے اندر کوئی متأثر ہوا ہو یا نہیں لیکن عالمی رائے عامہ کو گمراہ کرنے میں اس نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔مثال کے طور پر تحریر اسکوائر پر مرسی کے خلاف جمع ہونے والے مظاہرین کی تعداد کئی گنا بڑھا کر بیان کی گئی،اور اس کے لیے مصر کے عوامی انقلاب ۲۵/جنوری ۲۰۱۱ءکے موقع کی تصویریں استعمال کی گئیں، حالانکہ خود میڈیا سے وابستہ بعض بڑے تجزیہ نگاروں کی جانب سے یہ بات اب کھل کر سامنے آگئی ہے کہ جتنی تعداد بیان کی جارہی تھی،تحریر اسکوائر اس کا متحمل ہی نہیں ہے۔اس کے علاوہ میڈیا نے عوام میں معاشی مسائل،بجلی اور پانی وغیرہ کو لے کر بے چینی پیدا کرنے میں بہت ہی خطرناک کردار ادا کیا ہے۔اور آج حال یہ ہے کہ میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے پرامن مظاہرین پر دہشت گرد اور جہادی ہونے کا الزام دیتے ہوئے ان کا قتل عام کیا جارہا ہےاور عالمی برادری خاموش تماشائی ہے۔

دوسرے نمبر پر فوج ہے۔اس کے لیے فوجی جنرل عبدالفتاح سیسی کو استعمال کیا گیا،اور اسے لالچ دی گئی کہ وہ مصر کا صدر بن جائے گا۔ چنانچہ جب اس نے مرسی کے ساتھ غلط انداز اختیار کرنا شروع کیا، اور فوج کی اعلی قیادت کو اپنا حامی بنالیا،اس وقت مرسی نے اس کو منانے اور کنٹرول کرنے کی ہر ممکن کوشش کی،حتی کہ اپوزیشن کی جانب سے پیش کردہ پانچوں مطالبات بھی قبول کرنے کی پیشکش کردی،لیکن اس نے صاف انکار کردیا،اور اس طرح اس کی قیادت میں فوج نے آگے بڑھ کر بغاوت کا اعلان کردیا۔

تیسرے نمبر پر دستور اور حکومت کی پالیسیوں کے تعلق سے وہ غلط فہمیاں ہیں جو مرسی،اخوان اور اسلام پسندوں کے خلاف عام کی گئی ہیں حالانکہ جو شخص بھی کھلے ذہن کے ساتھ ان کا جائزہ لے گا،وہ یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مرسی نے مصر کے نئے دستور اور اپنی حکومتی پالیسیوں کے ذریعہ جس رواداری کا ثبوت پیش کیا ہے، وہ اس سے پہلے کبھی بھی مصری دستور میں نہیں نظر آئیں،اور خود بعض بڑے عیسائی تجزیہ نگار جن میں ڈاکٹر رفیق حبیب سرفہرست ہیں، کہتے ہیں کہ مصر میں اقلیتوں کے حقوق کے سلسلے میں جو الزام ڈاکٹر مرسی پر عائد کیا گیا ہے وہ سراسر غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ جہاں تک یہ بات کہ مرسی نے اخوانیوں کے ذریعہ مصری اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی،اور دیگر افراد کو اقتدار میں شریک نہیں کیا تھا، یہ بات بھی سراسر خلاف واقعہ ہے،مرسی نے جس حکومت کی تشکیل کی تھی اس میں چند ایک وزارتیں اپنی پارٹی کے حوالے کی تھیں،اور بقیہ تمام وزارتیں دوسروں میں تقسیم کردی تھیں،اور اپوزیشن کو اقتدار میں شریک کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی،جس کے نتیجے میں بعض افراد شامل بھی ہوئے تھے۔خود ملک کا وزیر اعظم ’ہشام قندیل‘ نامی شخص کو بنایا جس کا دور دور تک اخوان سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔حزب النور جس کی منافقت اور عیاری اس موقع پر کھل کر سامنے آگئی،خود اس پارٹی کو اقتدار میں نہ صرف شریک کیا، بلکہ

متعدد اہم وزارتیں بھی ان کے حوالے کیں۔

چوتھی چیز مذہبی قیادت ہے، حزب النور کے علاوہ شیخ الازہر اور عیسائی پوپ نے اس موقع پر جس بددیانتی کا ثبوت پیش کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، فوجی بغاوت کا اعلان کرنے کے لیے جو باقاعدہ اسٹیج سجایا گیا، اس میں یہ قیادت سرفہرست تھی۔ اس موقع پر بعض مسلم قائدین اور علماء کے ساتھ زبردست سودے بازی ہوئی، مصری علماء کی بڑی اکثریت کی رائے کے علی الرغم 'سرکاری علماء' سے اخوان کے خلاف فتوے جاری کرائے گئے، اور فوجی بغاوت میں ان کا ہر ممکن تعاون حاصل کیا گیا، مثال کے طور پر شیخ الازہر کو استعمال کیا گیا، جبکہ پورا ازہر شریف مرسی کے حق میں اور فوجی بغاوت کے خلاف سینہ سپر رہا، اور گزشتہ ایام پیش آئے واقعات میں تقریباً تیس ازہری علماء شہید بھی ہوئے۔ تعجب کی بات ہے کہ شیخ الازہر، مفتی دیار مصریہ اور اس کے علاوہ بعض سلفی علماء ان تمام واقعات کے باوجود اپنے مغربی اور خلیجی آقاؤں کے اشاروں پر چل رہے ہیں، انہیں مصری عوام پر ہونے والے مظالم، انسانی حقوق کی پامالی، اور اللہ رب العزت کی گرفت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

(۵) میڈیا کا بدترین کردار

مرسی حکومت کو ناکام ثابت کرنے کے لیے میڈیا نے ملک کی عوام کے علاوہ عالمی سطح پر بھی رائے عامہ کو بری طرح سے گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ گزشتہ سطور میں تفصیل کے ساتھ یہ بات پیش کی گئی کہ فی الواقع میڈیا نے اس موقع پر حقائق کو مسخ کرنے اور دن کو رات ثابت کرنے کی کس قدر بدترین مثال پیش کی ہے۔ ۱۴ اگست کو محض ایک دن میں کئی ہزار شہادتیں ہوئیں، تاہم میڈیا نے اس کو تقریباً دس گنا گھٹا کر پیش کیا۔ جبکہ اس سے قبل تحریر اسکوائر پر مرسی مخالف لاکھوں مظاہرین کو کئی کروڑ بنا کر پیش کیا، حالانکہ اسی میڈیا کے پیش کردہ حقائق بتاتے ہیں کہ اس میدان کے اندر اتنے افراد دُور کی بات، اس سے دس گنا کم بھی بمشکل ہی آسکیں گے۔

صحیح تجزیے کی ضرورت

ڈاکٹر مرسی ظالم مصری حکمران حسنی مبارک کے خلاف عوامی انقلاب کے نتیجے میں برسر اقتدار آئے تھے۔ انتخابات کے نتیجے میں آپ ملک کے پہلے جمہوری صدر منتخب ہوئے اور پورے ایک سال تک اقتدار میں رہے۔ اس دوران آپ کے خلاف حسنی مبارک کے باقیات (بیوروکریسی، عدلیہ، انٹلی جنس، فوج، اور میڈیا) نیز بعض نام نہاد عالمی قوتوں کے ذریعہ جس طرح سازشیں رچی گئیں اور آپ کے خلاف گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی گئی اس کا بے لاگ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مرسی حکومت کے ایک سال کا تجزیہ کرتے وقت اس چیز کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

دوسری چیز جو عام طور پر ان تجزیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ کہ ان تجزیوں کی بنیاد مغربی میڈیا کی

جانب سے دیئے گئے اعداد وشمار اور خبریں ہوتی ہیں، اور یہ چیز بالکل واضح ہے کہ مرسی حکومت کا تختہ پلٹنے کے لیے رچی جانے والی سازشوں میں میڈیا، بالخصوص مغربی میڈیا نے بہت ہی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ آج بھی میڈیا کا کردار بالکل ہی جانبدارانہ ہے، اس کی جانب سے وہی خبریں نشر ہوتی ہیں جو وہاں کی فوجی حکومت فراہم کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے تجزیہ نگار کسی نہ کسی پیمانے پر مغربی میڈیا یا اسلام دشمن میڈیا کے پروپیگنڈے کا شکار بن رہے ہیں۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے تجزیہ نگار بھی مرسی پر یہی الزام رکھ رہے ہیں کہ انہوں نے نئے دستور میں اقلیتوں کو ان کے حقوق نہیں دیئے، انہوں نے حکومت میں سماج کے مختلف طبقات کو کوئی جگہ نہیں دی تھی، اور ایک سال کے اندر مصر سخت معاشی بحران کا شکار ہو گیا تھا، وغیرہ وغیرہ، جبکہ حقائق، جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا، ان الزامات کی کھلی نفی کرتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ مصر کے سلسلے میں ایک ایسا تجزیہ کیا جائے جس میں محض مغربی میڈیا پر بھروسہ کرنے کے بجائے مغربی میڈیا اور اسلام پسند میڈیا دونوں ہی کو دیکھا جائے، اور دونوں کی خبروں کو سامنے رکھ کر بے لاگ اور صحیح صحیح تجزیہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر شہادتیں ۶ر ہزار ہوئیں یا ۶ر سو، اس سلسلہ میں اخوانی ذرائع میدان رابعہ میں موجود ہسپتال کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور انہوں نے شہداء کی فہرست بھی جاری کی، جب کہ مغربی میڈیا نے فوجی حکومت کی جانب سے جاری کردہ پریس ریلیز اور بیانات پر اعتماد کیا۔ تحریر اسکوائر پر کتنے لوگ موجود تھے، مغربی میڈیا نے اس کی تعداد دو کروڑ تک بیان کی ہے جبکہ حقائق اس طور پر اس کی نفی کرتے ہیں کہ اس میدان کا حجم بیس لاکھ سے زائد تعداد کا متحمل ہی نہیں۔ مغربی میڈیا کہتا ہے کہ اقلیتوں کو نئے دستور میں حقوق نہیں دیئے گئے اور حقائق بتاتے ہیں کہ ان کے حقوق دستور میں تحریری طور پر اور واضح انداز میں محفوظ ہیں۔ میڈیا کہتا ہے کہ مرسی نے حکومت میں دوسروں کو شریک نہیں کیا، اور حقائق بیان کرتے ہیں کہ چند ایک وزارتوں کو چھوڑ کر تمام ہی وزارتیں دوسروں کو دی گئیں جن کا اخوان سے کوئی رشتہ نہیں تھا، وزیر اعظم تک ایک ایسے شخص کو بنایا گیا جس کا اخوان یا اسلامی تحریک سے دور دور تک کوئی رشتہ نہیں تھا، وغیرہ وغیرہ۔

قصۂ مختصر

قصہ مختصر یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد مرسی مصر کو ایک آزاد اور خود مختار جمہوری ریاست کے طور پر آگے بڑھانا چاہتے تھے، ایک ایسی ریاست جو

اپنی پالیسیوں اور فیصلوں میں آزاد ہو؛
اپنی تجارت اور معیشت میں آزاد ہو؛
اور جو اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے۔

یقیناً یہ چیز مغربی حکمراں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

●◘●

غالب کی نثر نگاری اور ظرافت

راحت سلطانہ *

مرزا اسد اللہ خان غالب اردو شاعری کے عہد زریں کے ان شعراء میں سے ہیں جن پر اردو شاعری ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ غالب اپنے ابتدائی دور میں زیادہ تر فارسی میں کہتے اور لکھتے تھے، اور اردو میں کہنا اور لکھنا کسرِ شان سمجھتے تھے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کو اصل شہرت ان کے اردو کلام اور اردو خطوط نویسی کے سبب حاصل ہوئی۔ مرزا غالب نے اپنے انفرادی رنگ اور اچھوتے اسلوبِ بیان سے اردو شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، اور عام روایت سے ہٹ کر اردو غزل کے دائرہ کو کافی وسعت دی ہے۔ غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے موضوعات کو جگہ دی، اس طرح اردو غزل میں، جو محض عشق و عاشقی، حسن و جمال، جور و جفا، شکوہ و گلہ، معشوق کی بے وفائی، یاسِ ہجر اور تمنائے وصال جیسے مضمون تک محدود تھی، اس میں ہر قسم کے مضامین بیان کیے جانے لگے۔

غالبؔ گو کہ اقبال کی طرح فلسفی نہیں تھے تاہم انھوں نے زندگی کے مسائل کو بہت غور سے دیکھا ہے۔ ان کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اپنی شاعری کو ان مسائل کی عقدہ کشائی کا ذریعہ بنانے کی سعی کی ہے۔ غالبؔ نے کم عمری ہی سے شعر گوئی شروع کر دی تھی مگر اس کم سنی میں بھی ان کا تخیل عروج کی انتہائی منزل تک پہنچا ہوا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اشعار کا مطلب کم ہی لوگ سمجھ پاتے تھے اور بمشکل ہی سمجھ پاتے تھے۔ سبھی لوگوں کو ان کی مشکل گوئی کی شکایت تھی، چنانچہ ان سے آسان گوئی کی سفارش کی جاتی تھی۔ غالب اپنی مہمل گوئی کی بات سن کر کبھی کبھی بہت ہی جز بز ہو جاتے تھے، غالباً درج ذیل شعر ان کی اسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے؛

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنیٰ نہ سہی

اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے ایک بار یہ تک کہہ دیا کہ؛

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　　سن سن کے جسے سخنورانِ کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گو یم مشکل و گر نہ گویم مشکل

غالب یہاں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں اگر خاموش رہتے ہیں تو ان سے شعر گوئی کی التجا کی جاتی ہے، اور اگر کہتے ہیں تو کسی کے پلے نہیں پڑتا۔ وہی بات، 'گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'۔

غالب ایک ظریف آدمی تھے، ہنسنا ہنسانا گویا ان کی سرشت میں داخل تھا۔ خود ہی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں ''میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی ایسی بات لکھوں کہ جو پڑھے خوش ہو جائے''، اور وہ ایسا کرتے بھی تھے اور اس میں ان کو اچھا ملکہ حاصل تھا۔ حد تو یہ ہے کہ تعزیتی خطوط میں بھی انھوں نے اپنی ظرافتِ طبع سے ہنسانے کا پہلو ڈھونڈھ نکالا۔ ان کی تیسری بیوی کا انتقال ہوا تو تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اللہ اللہ ایک وہ لوگ ہیں جو تین تین دفعہ اس قید سے چھوٹ چکے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اگلے پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے''۔ واضح رہے کہ اس وقت غالب کی شادی کو اکیاون سال ہو چکے تھے۔ اردو شاعری کے علاوہ اردو نثر میں بھی غالب کا ایک بڑا نام ہے۔ اگرچہ انھوں نے نثری ادب میں کوئی خاص ذخیرہ یا کوئی ضخیم ادبی کتاب نہیں چھوڑی، لیکن ان کے اردو خطوط نے نثر نگاری میں ایک نئی اور آسان راہ دکھائی۔ ان سے پہلے بناوٹ اور عبارت آرائی پر زیادہ دھیان دیا جاتا تھا۔ انہوں نے قدیم اسلوبِ بیان ترک کر کے سادہ اور آسان طرزِ تحریر اختیار کیا ہے، اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں نے وہ طرزِ تحریر اختیار کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ سو کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

غالب شعری ظرافت کے بھی شہنشاہ ہیں۔ شوخی و ظرافت کے تیر جب ان کی شاعری سے نکلتے ہیں تو کسی کو نہیں چھوڑتے، حتیٰ کہ خود اپنی ذات کو بھی طعن و تشنیع اور طنز کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے، فرماتے ہیں؛

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ایسی جنت کا کیا کرے کوئی
زاہد نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمھارے شرابِ طہور کی

غالب کی شاعری کے بارے میں اردو کے عظیم قائد اور مستند ادیب پروفیسر آل احمد سرور کا ایک تبصرہ لمبے چوڑے مضمون پر بھاری ہے، موصوف رقم طراز ہیں:

''ہماری شاعری جو غالب سے پہلے صرف دل والوں کی دنیا تھی، غالب نے اسے ذہن دیا۔ انہوں نے غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے موضوعات داخل کیے، اور اس کے موضوعات کو بہت وسیع کر دیا''

غالب اور علامہ اقبال اردو زبان و ادب کے وہ آفتاب و ماہتاب ہیں جن کی ادبی ضیا پاشیوں سے

اردو زبان کو چار چاند لگ گئے۔ یہ دونوں وہ خوش قسمت ہستیاں ہیں جن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ دریں صورت فطری طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا عوامل ہیں جنہوں نے غالبؔ کو تمام اردو شعراء پر غالب کر دیا۔ اس سلسلے میں غور وفکر سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے کئی اسباب ہیں، جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

سب سے پہلی اور بنیادی چیز غالبؔ کی جدت طرازی ہے جس میں وہ اوروں سے کافی ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی فکر رسا نے صنائع و بدائع میں قدم قدم پر جدت طرازیاں کی ہیں، مثلاً تشبیہ میں جدت طرازی، تمثیل میں جدت طرازی، استعارات میں جدت طرازی، اسلوبِ بیان میں اور استعمالِ الفاظ میں جدت طرازی وغیرہ وغیرہ۔

دوسری بنیادی چیز غالبؔ کے انداز بیان کی جامعیت اور ان کی قادرالکلامی ہے۔ بنابریں بلاخوفِ تردید کیا جاسکتا ہے کہ غالبؔ کا کلام ''خَیْرُ الْکَلَامِ مَا قَلَّ وَ دَلَّ'' کا بہترین مصداق اور آئینہ دار ہے، فرماتے ہیں؛

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانوں کا ہوگا

اور اپنی قادرالکلامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فارسی میں کہہ رہے ہیں؛

چوں نہ ناز وسخن از مرحمتِ دمر بہ خویش
کہ مرد عرنی و غالب بہ عوض باز در

تیسری اہم چیز شوخی وظرافت ہے، جس کے بارے میں گفتگو کی جا چکی ہے۔

چوتھی چیز ان کی شاعری کا استفہامیہ انداز واسلوب ہے، غالبؔ نے روزمرہ کے معمولی ادواتِ استفہام کو اپنے اشعار میں استعمال کر کے شعر کو سحر کے روپ میں ڈھال دیا ہے جس سے قاری پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے؛

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں   روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا   نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کوئی مزار ہوتا

قصہ کوتاہ اینکہ غالبؔ اردو زبان وادب کے ایک عظیم شاعر اور ایک عظیم نثر نگار تھے۔ انہوں نے عام روش سے ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ نکالی، پرانے اسلوبِ بیان کو ترک کر کے اپنا مخصوص طرز تحریر اختیار کیا۔ جس نے ان کو عظیم شہرت عطا کی اور اردو نثر و نظم میں انہیں زبردست مقام عطا کیا۔

*ریسرچ اسکالر، اردو ڈپارٹمنٹ شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج۔ اعظم گڑھ

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

راشد حامدی فلاحی*

اردو زبـــان وادب کے معروف شاعروادیب اور نقاد شبنم سبحانی یکم ستمبر۲۰۱۳ءکومختصرترین علالت کے بعداس دارِفانی سے کوچ کرگئے۔ یہ خبراتنی جانکاہ تھی کہ یقین ہی نہیں ہوتا تھا کہ شبنم سبحانی صاحب ہم سے ہمیشہ ہمیش کے لیے دور ہوگئے ہیں۔سچ کہا ہے کسی نے کہ کچھ حقیقتیں اتنی تلخ ہوتی ہیں کہ اس پریقین کرنے پردل آمادہ نہیں ہوتا۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ ۲۴راگست کومرکز جماعت اسلامی ہندابوالفضل میں ادارۂ ادبِ اسلامی کی نومنتخب مجلس عاملہ کی میٹنگ تھی،بعض ناگزیروجوہات کی بناپر یہ میٹنگ ملتوی کرنی پڑی تو ہم لوگوں نے سوچا کہ موقع اچھا ہے اس سے فائدہ اُٹھایا جائے اور شبنم سبحانی صاحب سے ادارۂ ادب اسلامی کی نئی میقات کے لیے رہنمائی حاصل کی جائے۔چنانچہ ڈاکٹرحسن رضا صاحب(نومنتخب صدر ادارۂ ادبِ اسلامی،ہند)،ڈاکٹر تابش مہدی صاحب(نائب صدرادارۂ ادبِ اسلامی،ہند)،حسنین سائرصاحب(نو منتخب جنرل سکریٹری ادارۂ ادبِ اسلامی،ہند)اورعبدالغفارصاحب(نومنتخب سکریٹری ادارۂ ادبِ اسلامی)ان کے دولت کدے پرحاضرہوئے،ہیچمداں بھی ایک کفش بردار کی حیثیت سےان کے ہمراہ تھا۔انہوں نے ہم لوگوں کا نہایت پرتپاک انداز میں استقبال کیا،اورہم لوگوں کی آمد پرخوشی کا اظہار کیا۔

ادارۂ ادبِ اسلامی کے تعلق سے انہوں نے اپنے تیس سالہ دورِصدارت کے تجربات کی روشنی میں ہم لوگوں کو قیمتی مشوروں سے نوازا اوراس بات پر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا کہ ادارۂ ادبِ اسلامی کے دفتری کاموں کے لیے مرکز جماعتِ اسلامی ہند میں دو کمرے مخصوص کردیئے گئے ہیں۔یہی نہیں بلکہ وہ ہم لوگوں کے ہمراہ مرکز جماعت آئے مخصوص کیے گئے کمرے دیکھے اورخوش ہوکر کہا کہ میں ادارہ کے بلیماران میں واقع دفتر دوری کی وجہ سے نہیں جاپاتا تھا،مگراب میں اس آفس میں روزانہ تین چار گھنٹے رضا کارانہ طورپردوں گا اور یہاں بیٹھ کرادارے کے لیے کام کروں گا مگر مشیت ایزدی کوشاید یہ منظور نہ تھا،وہ اس سے پہلے ہی ہم سے جدا ہوگئے۔

وہ چاروں حیثیتوں یعنی علمی و عملی اور ذہنی وجسمانی طور پر بالکل زندہ اور توانا نظر آرہے تھے، وہی مسکراتا ہوا شبنمی چہرہ، وہی شبنم مزاجی ونرم گفتاری، وہی انکسار وخاکساری، وہی اخلاق ووضعداری، وہی تازگی و شگفتگی، وہی دلوں کو موہ لینے والا میٹھا اور دھیما لہجہ۔ اُن کے لہجے اور پُرعزم گفتگو سے اس بات کا قطعاً احساس نہ ہوتا تھا کہ یہ ہم لوگوں کی اُن سے آخری ملاقات ثابت ہوگی اور وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ہم سے جدا ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی نے ۷رستمبر ۱۹۳۷ء کو ٹانڈہ ،ضلع فیض آباد کے ایک متوسط علمی خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم ٹانڈہ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم گورکھپور اور لکھنؤ یونیورسٹی سے مکمل کی۔ اردو اور انگلش میں ایم اے کیا۔ اس درمیان ثانوی درسگاہ رامپور میں تربیتی کورس مکمل کیا، اور پھر اردو سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے۔ شعبۂ اردو، جی ایس پی جی کالج سلطان پور میں ریڈر اور صدر شعبۂ اردو کے منصب پر متمکن ہو کر ریٹائرڈ ہوئے۔

شبنم سبحانی صاحب اوائل عمری میں تحریکِ اسلامی سے شعوری طور پر منسلک ہو گئے تھے۔ ثانوی درسگاہ رامپور سے تربیت پا کر ان کا شعور اور روشن ہو گیا۔ روشنی جوں جوں تیز ہوتی گئی ان کا تخلیقی و تنقیدی شعور اور فریم ورک وسیع اور منضبط ہوتا گیا۔ وہ ہندوستان میں اس وقت شعر وادب میں اسلامی فکر اور صالح اقدار کے سب سے بڑے ترجمان اور علمبردار تھے۔ انھوں نے اوائلِ عمری میں جو ڈگر اور سمتِ سفر اپنے لیے متعین کی تھی ساری عمر وہ اسی ڈگر پر گامزن رہے، پیچھے مڑ کر دیکھنا تو دور، انھوں نے کبھی دائیں بائیں بھی نہیں دیکھا۔ روشِ عام پر چلنا اس مردِ مومن نے کبھی گوارہ نہیں کیا۔ وہ چاہتے تو اپنے رویہ میں تھوڑی سی لچک پیدا کر کے بے شمار مراعات حاصل کر سکتے تھے، مگر انھوں نے کسی قسم کا کوئی سمجھوتا کیا نہ مداہنت اختیار کی، بلکہ ہر قسم کے مصالحانہ رویوں سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ ان کا ایقان تھا کہ رات خواہ کتنی طویل اور ڈراؤنی ہو صبح ضرور طلوع ہوگی، وہ سرخ سویرے کے سودائی نہیں صبحِ صادق کے شیدائی اور تمنائی تھے۔ وہ رات کی ظلمت میں مانگے ہوئے اجالے نہیں، دن کی ایسی روشنی کے طلب گار تھے جو کائنات کو ہی نہیں انسان کے اندرون کو بھی اجّول کر دے، جو انسان کی سوچ کے زاویے اور دھارے بدل دے، انسان کے ہر عمل کو اخروی زندگی سے پہلے دنیوی زندگی کے لیے مؤثر بنا دے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر شعر وادب فنونِ لطیفہ کے زمرے سے نکل کر عبادت بن جاتا ہے۔ اور حسن وخیر کے دائمی اسلامی اقدار پر ایمان ویقین مزید پختہ ہو جاتا ہے۔ شبنم سبحانی صاحب پوری زندگی ادب میں سچائی، صداقت اور خیر وفلاح کے علمبردار رہے، انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اسی پیمانے پر جانچ پرکھ کر لکھا، اور اپنے اصولوں کا کبھی سودا نہیں کیا۔

میں سر بازار وسر دربار انگشتِ شہادت اُٹھا کر ظالم کو ظالم قرار دینے، نہایت مخالف ماحول میں نڈر ہو کر کلمۂ حق کہنے، روشِ عام سے ہٹ کر ادب میں صالح افکار واقدار کی حمایت کرنے نیز خیر وفلاح اور صداقت وسچائی کا علم بلند کرنے کو سب سے بڑا جہاد سمجھتا ہوں۔ اس تناظر میں انھیں ''مجاہد اردو ادب'' کہنا قطعاً بے جا نہ ہوگا۔ ہندوستان کے ادبی منظر نامے میں ان کا وجود صالح اقدار کے حامل شعراء اور ادباء کے لیے ایک منارۂ نور کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ انھوں نے جو روشن ورثہ چھوڑا ہے وہ دور تک اور دیر تک آنے والی نسلوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا رہے گا۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

شبنم سبحانی نے باطل نظریات سے لوہا لینے کے لیے اپنے پیکرِ خاکی ہی میں جاں پیدا نہیں کی تھی بلکہ اپنے تخلیقی فریم ورک کو اتنا مضبوط کر لیا تھا اور اپنے گرد صالح عناصر کا ایسا مقناطیسی حصار قائم کر لیا تھا کہ شعر وادب کے غیر صالح عناصر اس سے ٹکرا کر فنا کے گھاٹ اتر جاتے تھے۔

حضرت شبنم سبحانی صاحب نے تقریباً نصف صدی تک ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور اس میں انمٹ نقوش چھوڑے۔ جہاں انھوں نے معرکتہ الآرا نظمیں کہیں جسے اپنوں اور غیروں سب نے سراہا وہیں ان کی غزلوں کی پذیرائی بھی ہوئی، نقد وتبصرہ میں بھی ان کی جولانیٔ طبع دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، کئی اسلامی موضوعات کو بھی انھوں نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا مگر جتنی پذیرائی کے وہ حقدار تھے وہ محض اس وجہ سے ان کو نہ مل سکی کہ وہ شعر وادب میں اسلامی فکر اور صالح اقدار کے ترجمان اور مبلغ تھے حالانکہ ان کا ادبی سرمایہ کسی بھی طور پر کم مایہ نہیں ہے بلکہ اگر تلنا کی جائے تو بہت سے نام نہاد ادیبوں اور شاعروں کے مقابلے میں ان کا ادبی سرمایہ کہیں زیادہ وقیع ثابت ہوگا۔

شبنم سبحانی صاحب بنیادی طور پر ایک استاذ تھے انہیں ملتِ اسلامیہ کے تعلیمی کاز سے بے حد دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں جامعۃ الفلاح سے بے حد محبت تھی۔ وہ جامعۃ الفلاح اور وہاں کے طلبہ و اساتذہ سے مخلصانہ محبت کرتے تھے، طلبہ بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ جامعۃ الفلاح سے شبنم صاحب کی محبت کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جامعۃ الفلاح کا ترانہ بھی شبنم صاحب نے تحریر کیا ہے جس کی گنگناہٹ سے فلاح کی صبح کا آغاز ہوتا ہے۔ ترانے کا ایک ایک مصرعہ اور ایک ایک بند ان کی دلی کیفیات کا مظہر ہے۔ وہ جامعۃ الفلاح کے طلبہ سے کس قسم کی توقعات رکھتے تھے اور انہیں مقاصدِ جامعہ سے کس درجہ وابستگی تھی، اس ترانے سے اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ میں جس وقت جامعۃ الفلاح میں زیر تعلیم تھا تو شبنم صاحب اکثر اکابرین تحریکِ اسلامی کے ہمراہ جامعۃ الفلاح تشریف لاتے تھے اور

ہم لوگوں کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے تھے۔شبنم سبحانی صاحب کی وفات حسرت آیات جامعۃ الفلاح، وہاں کے طلبہ و مدرسین ومحبین اور ذاتی طور پر خود میرے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔

شبنم صاحب مجھ سے والدِ محترم مولانا سید حامد علی صاحب مرحوم ومغفور کے حوالے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔جس وقت یہ جانکاہ حادثہ رونما ہوا، اس وقت انجمن طلبۂ قدیم کے آرگن ''حیاتِ نو'' کا تازہ شمارہ پریس میں جانے کو تیار تھا۔ اس لیے بہت ہی عجلت میں یہ چند سطور سپردِ قرطاس کی ہیں۔اس مختصر سے مضمون میں یہ ممکن نہیں ہے کہ شبنم سبحانی صاحب کی تعیینِ قدر کی جاسکے، آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ شبنم سبحانی صاحب کے تخلیقی وتنقیدی سرمایہ پر سیر حاصل گفتگو کی جائے گی۔

حضرت سید عبدالباری شبنم سبحانی صاحب پوری زندگی ہم لوگوں کی ذہنی وفکری تربیت اور رہنمائی کے لیے شبنم افشانی فرماتے رہے، اب بقول علامہ اقبال، ان کے لیے بس یہی کہا جاسکتا ہے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ان کے درجات کو بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

*نئی دہلی۔ای میل:s.rashidhamidi@gmail.com

بقیہ: جامعہ کے لیل ونہار

آپ کے سانحہ ارتحال پر جامعہ میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس میں شعبہ اعلی کے جملہ طلبہ واساتذہ موجود تھے، اس موقع پر مولانا محمد اسماعیل فلاحی، مولانا نعیم الدین اصلاحی اور مولانا انیس احمد فلاحی مدنی نے مرحوم کے تعلق سے اپنے تأثرات بیان کئے۔

مولانا مطیع اللہ فلاحی مدنی کو صدمہ

یکم ستمبر ۲۰۱۳ء کو جناب مولانا مطیع اللہ فلاحی مدنی صاحب کی اہلیہ محترمہ اور جناب احمد کلیم فلاحی صاحب کی والدہ محترمہ اس دارفانی سے کوچ کرگئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بعد نماز عصر مرحومہ کی نماز جنازہ امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند حلقہ یوپی مشرق مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی نے پڑھائی، جس میں ذمہ داران جامعہ، اساتذہ جامعہ اور طلبہ جامعہ کی بڑی تعداد شریک رہی۔ادارہ حیات نو مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت اور پسماندگان کے لیے دعائے صبر جمیل کی درخواست کرتا ہے۔

*استاذ شعبۂ اعلیٰ جامعۃ الفلاح

نثار احمد فاروقی

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

نام کتاب: نثار احمد فاروقی: پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
مرتب: ثاقب عمران
ضخامت: ۶۰۰ رصفحات
قیمت: ۶۰۰ رروپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

پروفیسر نثار احمد فاروقی علمی دنیا کی معروف ومشہور شخصیت تھی۔ علم وتحقیق ان کی فطرت میں تھی، اور علم کے حصول اور اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے دور دراز کی لائبریریوں تک کا سفر کرنا ان کا شوق تھا۔ ان کے اندر علمی گہرائی اور علمی وسعت دونوں چیزیں تھیں۔ اسی لیے ان کے انتقال کے بعد علمی وتحقیقی دنیا میں زبردست خلا محسوس کیا گیا۔ انتقال کے بعد مختلف رسالوں میں ان کی زندگی اور ان کی علمی خدمات پر مضامین شائع ہوئے، لیکن یہ تمام مضامین ابھی تک بکھرے ہوئے تھے، اور ان تک ہر شخص کی رسائی آسان نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ اب تک موصوف کی حیات وخدمات پر مستقل کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آسکی تھی۔ جبکہ اس کی سخت ضرورت آج نہیں تو کچھ عرصے بعد یقیناً محسوس کی جاتی کہ ان تمام مضامین کو کتابی صورت میں یکجا کیا جائے تاکہ بعد لوگ ان کی علمی وتحقیقی خدمات سے واقف ہوسکیں، اور استفادہ بھی کرسکیں۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی کا علمی دنیا کا جتنا بڑا نام تھا، خودنمائی اور دادطلبی سے وہ اتنا ہی دور تھے۔ کتاب میں شامل ایک انٹرویو سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ وہ انٹرویو کی فرمائش کرنے والے کو ۲۵ رسال تک محض اس لیے طرح دیتے رہے کہ ''اپنے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ تو ''میاں مٹھو'' خواہی نہ خواہی بننا ہی پڑتا ہے''۔

جناب ثاقب عمران فلاحی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو میں ریسرچ اسکالر ہیں، انہوں نے اپنا

ایم فل کا مقالہ نثار احمد فاروقی کی ادبی خدمات پر ہی تحریر کیا ہے، جس کا عنوان ہے ''نثار احمد فاروقی کی ادبی خدمات: تلاش میر اور تلاش غالب کے حوالے سے''۔ اس مقالے کی تیاری کے دوران نثار احمد فاروقی کی تحریریں پڑھنے کے بعد انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ نثار احمد فاروقی کی شخصیت کس مقام اور مرتبے کی حامل ہے، حالانکہ ان کی شخصیت پر کوئی بھی مرتب اور یکجا چیز موجود نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے اس کام کو کرنے کا بیڑہ اٹھایا کہ ان کی شخصیت پر موجود تحریروں کو ایک ترتیب کے ساتھ یکجا کیا جائے، اور تشنہ پہلوؤں پر نئے مضامین لکھوائے جائیں۔ اس طرح موصوف کی کوششوں سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا، اور آخر کار ''نثار احمد فاروقی: پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ'' کے نام سے یہ کتاب طبع ہو کر منظر عام پر آ گئی۔ ۶۰۰ ر صفحات کی اس کتاب میں ۵۶ ر مضامین ہیں، جن میں سے ۲۶ ر مضامین ان کی شخصیت پر ہیں، جن میں سے ۲ ر مضامین میں موصوف کے حالات خود انہی کی زبانی بیان ہوئے ہیں۔ ایک مفصل مضمون مرتب کا تحریر کردہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ ۲۱ ر مضامین ان کی تحقیقی و تنقیدی خدمات کے سلسلے میں ہیں۔ ۹ ر مضامین میں ان کی مختلف کتابوں کے اوپر گفتگو کی گئی ہے۔ آپ کے مشاہیر کے نام اور مشاہیر کے آپ کے نام کچھ خطوط بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ اس طرح اس کتاب میں نثار احمد فاروقی کی شخصیت اور خدمات کے تعلق سے کافی کچھ مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے۔

کتاب ''نثار احمد فاروقی: پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ'' خدا نے چاہا تو ان کی حیات و خدمات پر کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دے گی، اور یہ بڑا کام کر کے جناب ثاقب عمران نے اپنا نام نثار احمد فاروقی کے عقیدتمندوں میں تو شامل کیا ہی ہے، خدا نے چاہا تو اس کے نیک اور بابرکت ثمرات بھی انہیں ضرور حاصل ہوں گے۔ گیٹ اپ اور طباعت کے اعتبار سے کتاب معیاری ہے۔ اردو کتابوں میں بالعموم استعمال ہونے والے عام کاغذ سے بہتر کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے، ٹائٹل سادہ لیکن خوبصورت اور جاذب نظر ہے۔ حروف کا سائز بھی مناسب ہے اور چھپائی بھی صاف ہے۔ البتہ عام اردو کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی اس عیب سے بالکل پاک نہیں رہ سکی، جو اردو کتابوں کی لازمہ بن گیا ہے، یعنی پروف کی غلطیاں، جو گرچہ اس کتاب میں کم ہیں، لیکن ہیں۔ امید کہ آئندہ اشاعت میں اس کی اصلاح کر لی جائے گی، ٹائٹل والے صفحے کی پشت پر درج کتابی کوائف سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ دوسرا ایڈیشن ہے، لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ پہلا ایڈیشن کب اور کہاں سے شائع ہوا تھا، حالانکہ اس کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا۔

تنویر آفاقی، E-7، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵
ای میل: tanveerafaqui@gmail.com

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی*

جامعہ میں نئے داخلے اور تعلیمی سیشن کا آغاز

ہر سال کی طرح امسال بھی جامعہ میں داخلہ کے لیے ملک بھر سے طلبہ اور طالبات جامعہ تشریف لائے ، اور نظم کے مطابق ٹسٹ کے بعد ان کا داخلہ لیا گیا۔ اعلان کے مطابق پہلا داخلہ ٹسٹ ۲۴/اگست بروز شنبہ کو ہوا، جس میں ۱۱۰/طلبہ اور ۱۲۶/طالبات کامیاب ہوئیں، جبکہ دوسرا ٹسٹ ۲۹/اگست کو ہوا، جس میں ۳۱/طلبہ اور ۴۰/طالبات کامیاب ہوئیں۔ معمول کے مطابق جامعہ کے نئے تعلیمی سیشن کا آغاز ہو چکا ہے اور طلبہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

جامعۃ میں پانچ روزہ سمر تربیتی کیمپ

مورخہ ۲۳/تا ۲۷/اگست ۲۰۱۳ء مادر علمی میں ہر سال کی طرح امسال بھی بعض فلاحی برادران کی کوششوں اور تعاون سے فضیلت اور عالمیتین کے طلبہ کے لیے پانچ روزہ سمر تربیتی کیمپ کا انعقاد کیا گیا۔ ۲۳/اگست بعد نماز مغرب اس افتتاحی سیشن کا آغاز ہوا، جس کی صدارت ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے فرمائی۔ افتتاحی کلمات میں جناب مولانا شاہد کریم فلاحی صاحب نے نے کیمپ کے انعقاد کا مقصد اور اس کی اہمیت وافادیت بیان کی۔ جس کے بعد شرکاء کیمپ کا باہمی تعارف ہوا، اور آخر میں ناظم جامعہ نے صدارتی خطاب کیا، جس میں موصوف نے شرکاء کو اس شاندار موقع سے حتی الامکان استفادہ کی ترغیب دلائی۔

۲۴/اگست بروز شنبہ کیمپ کے دوسرے دن کا آغاز بعد نماز فجر حافظ احسان الحق فلاحی کے درس قرآن سے ہوا، جس میں آپ نے طلبہ ونوجوانوں کو ان کی عظیم ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ اس روز باقاعدہ پہلے سیشن کا آغاز جامعۃ الفلاح کے استاذ تفسیر مولانا نعیم الدین اصلاحی کی گفتگو سے ہوا، آپ

نے 'سورہ یوسف کی روشنی میں مثالی نوجوان' کے عنوان سے خطاب کیا، آپ نے بتایا کہ قرآن مجید سے اس سلسلہ میں ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے اور ایک مثالی نوجوان کو کن کن خوبیوں سے آراستہ ہونا چاہئے۔ اس کے بعد 'تقوی کی اہمیت اور حقیقت' پر جناب محمد شاہد کریم فلاحی نے خطاب کیا، آپ نے قرآن وسنت کی روشنی میں تقوی کی حقیقت اور اس کے مظاہر پر سیر حاصل گفتگو کی۔ سورہ کہف پر استاذ جامعہ مولانا محمد اسماعیل فلاحی نے نہایت ہی عمدہ گفتگو کی اور آپ نے بتایا کہ ہمارا کردار کیسا ہونا چاہئے، اور ہماری گفتگو، ہمارے رہن سہن اور چال چلن میں کس طرح قرآنی اخلاق و کردار نظر آنا چاہئیں۔ اس کے بعد 'فقہ پر شبہات اور ان کے جوابات' کے عنوان پر استاذ جامعہ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی نے لکچر دیا۔ مغرب کے بعد دوسرے سیشن کا آغاز ہوا، 'حاملینِ قرآن کے اخلاق' کے عنوان پر ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی نے گفتگو کی اور اس کے بعد جناب محمد اکمل فلاحی استاذ جامعۃ الفلاح نے 'فہمِ قرآن سے دوری کے اسباب وعلل' پر مفصل گفتگو پیش کی۔

۲۵/اگست بروز یکشنبہ تیسرے دن کا آغاز بعد نماز فجر مولانا محمد عمران فلاحی استاذ جامعۃ الفلاح کے درسِ حدیث ہوا، آپ نے حدیث رسول کی روشنی میں بتایا کہ کن کن لوگوں کو قیامت کے دن اللہ رب العزت اپنے سایہ میں جگہ دے گا، اور ہم کیسے اس سایہ کو حاصل کر سکتے ہیں۔ تیسرے روز باقاعدہ پہلے سیشن کا آغاز 'نوجوانوں کی تربیت میں عقیدہ کا کردار' کے عنوان کے تحت مہتمم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی کی گفتگو سے ہوا، آپ کے بعد 'دعوت کا کام اور قرآنِ مجید کی روشنی میں اسوۂ نبوی' کے عنوان پر ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے ایک لکچر دیا۔ اس کے بعد ابوالاعلی سید سبحانی (ایڈیٹر رفیق منزل وحیات نو) نے عرب انقلابات کا ایک عمومی جائزہ لیتے ہوئے مصر کی صورتحال پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی، اور مولانا نظام الدین اصلاحی استاذ الاساتذہ جامعۃ الفلاح نے 'عصر حاضر کے چیلنجز اور ہمارے نوجوان' کے عنوان سے بہت ہی فکر انگیز گفتگو کی۔ بعد نماز مغرب دوسرے سیشن میں مولانا عبدالعظیم فلاحی نے 'رمضان کے بعد ہم کیا کریں' کے عنوان پر گفتگو کی، جس کے بعد طلبہ کے مابین ایک مذاکرہ ہوا، جس کا عنوان 'آخرت پر ایمان اور افراد و معاشرے پر اس کے اثرات' تھا، 13 طلبہ نے اس مذاکرہ میں بہت ہی دلچسپی کے ساتھ شرکت کی، آخر میں صدرِ مذاکرہ مولانا اخلاق کریمی قاسمی استاذ جامعہ نے صدارتی گفتگو کی۔

۲۶/اگست بروز دوشنبہ بعد نماز فجر مولانا نعیم الدین اصلاحی کے درس قرآن سے دن کا آغاز ہوا، آپ نے سورہ فرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں رحمٰن کے بندوں کی صفات تفصیل سے بیان کیں۔ دن کے پہلے سیشن کا آغاز مولانا اعجاز احمد قاسمی کی گفتگو سے ہوا، آپ نے 'سلفِ صالحین کا قرآن مجید سے تعلق' کے موضوع پر لکچر پیش کیا۔ اس کے بعد 'علوم قرآن ایک نظر میں' کے عنوان پر مولانا جاوید

سلطان خاں فلاحی نے گفتگو کی، آپ نے اپنی گفتگو میں اسبابِ نزول، مکی و مدنی سورتوں میں فرق، نسخ قرآن، اورقرأت سبعہ وغیرہ موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد صدر مدرس شعبہ اعلیٰ مولانا انیس احمد فلاحی نے 'قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ' کے عنوان پر گفتگو کی، آپ نے اپنے خطاب میں قرآن پر وارد ہونے والے شبہات واعتراضات کا تذکرہ کرتے ہوئے مدلل انداز میں ان کا جواب دیا۔اس کے بعد مولانا رئیس احمد فلاحی استاذ جامعہ کی نگرانی میں شرکا کیمپ کے مابین مسابقہ ہوا۔ بعد نماز مغرب دوسرے سیشن میں مولانا عمر اسلم اصلاحی استاذ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کا خطاب ہوا، آپ نے موجودہ حالات کے تناظر میں مسلم نوجوانوں کی ذمہ داریوں پر گفتگو کی، آپ نے موجودہ حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے، کچھ عملی مثالوں کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ مسلم نوجوانوں کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور وہ کس طرح بے راہ روی کا شکار ہیں۔اس کے بعد ابوالاعلی سید سبحانی نے 'عرب انقلابات۔ عالمی تناظر میں' کے تحت عرب انقلابات کے عالمی اثرات پر گفتگو کی، اور اس سلسلے میں اٹھنے والے شبہات اور سوالات کا تجزیہ پیش کیا۔

۲۷/اگست بروز سہ شنبہ بعد نمازِ فجر ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی نے درسِ حدیث پیش کیا، آپ نے اپنے درس میں موت کو یاد رکھنے اور اس کے بعد کے مراحل کے لیے تیاری کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے ان اسباب کا ذکر کیا جو موت کو یاد رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔اس کے بعد مہتمم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی کی صدارت میں اختتامی سیشن کا انعقاد ہوا۔جس میں ابتدا میں منتخب طلبہ اور محاضرین نے اپنے تأثرات پیش کیے۔اس کے بعد مہمان خصوصی مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی (امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند یوپی مشرق) نے 'یہود ونصاری اور مشرکین کی چالیں اور مسلم نوجوان' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح سے وہ مسلم نوجوانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور ان سے ہم کس طرح سے بچ سکتے ہیں، ہمیں اس سلسلے میں کیا عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔صدر مجلس کی گفتگو کے بعد مولانا جاوید سلطان خان فلاحی نے کلمات تشکر پیش کیے، اور آخر میں جملہ شرکا کیمپ کو اسناد اور مستحقین کو انعامات سے نوازا گیا۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں فضیلت کی سند ایم اے میں داخلہ کے لیے تسلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں جامعۃ الفلاح کی اسناد .B.A میں داخلہ کے لئے منظور تھیں۔ جامعہ کے فارغین .B.A میں داخلہ لے کر اپنی مزید تعلیم جاری رکھتے ہیں۔ عالمیت کی سند کی بنیاد پر .B.A میں داخلہ تو عام بات ہے۔ البتہ جامعہ کی درخواست تھی کہ جس طرح دیگر یونیورسٹیوں میں جامعہ کی سند فضیلت کی بنیاد پر بعض مضامین میں .M.A میں داخلہ لیا جا سکتا ہے اسی طرح مولانا آزاد یونیورسٹی میں سند فضیلت کی بنیاد پر .M.A میں داخلہ ملنا چاہئے۔ اللہ کا شکر ہے بعض فلاحی حضرات

کی کوششوں سے جامعہ کی یہ درخواست منظور کر لی گئی ہے۔اب آئندہ فضیلت کئے ہوئے طلبہ مولانا آزاد یونیورسٹی میں اپنی سند کی بنیاد پر .M.A کرنے کے مجاز ہوں گے۔

مشرق وسطی کے حالات پر ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی کا توسیعی لکچر

ماہ اگست کے اواخر میں جامعہ کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ کے موقع پر رکن انتظامیہ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طلبہ واساتذہ جامعہ کے سامنے ایک توسیعی لکچر ہوا، جس میں آپ نے مشرق وسطی کی سیاسی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے مصر کے حالات پر بہت ہی دلچسپ اورفکرانگیز گفتگو پیش کی، جس میں آپ نے بالخصوص مصری سیاست اوراخوان المسلمون کے کردار کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے حالیہ واقعات پر بھرپور تبصرہ پیش کیا۔ پروگرام کے آغاز میں مولانا محمد اسماعیل فلاحی استاذ جامعہ نے موصوف کا تعارف کرایا، اوراختتام میں مولانا انیس احمد فلاحی مدنی صدر مدرس شعبہ اعلی نے کلمات تشکر پیش کیے۔

جمعیۃ الطلبہ کا نیا انتخاب

نئے تعلیمی سال کے آغاز کے ساتھ ساتھ جمعیۃ الطلبہ کے ذمہ داران کا نیا انتخاب عمل میں آچکا ہے، سرپرست جمعیۃ الطلبہ مولانا محمد اسماعیل فلاحی اورنگران اعلی مولانا ولی اللہ مجید قاسمی کی نگرانی میں انتخابات پایہ تکمیل کو پہنچے، نئے ذمہ داران کے نام کچھ اس طرح ہیں:

سکریٹری: عدنان اظہر۔ لائبریرین: عارف سردار۔ معتمد خطابت: عبدالمتین اشرف۔ معتمد تحریر: نعمان انیس۔ رسائل وجرائد: محمد آصف۔ گیم انچارج: محمد اسرافیل۔ باغبانی: محمد فیصل۔

اسلامی ادب کا عظیم رہنما اب ہمارے درمیان نہیں رہا

یکم ستمبر ۲۰۱۳ء کو ہندوپاک میں ادب اسلامی کے قافلے کے عظیم رہنما جناب ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی ایک طویل داستان عزیمت رقم کرتے ہوئے اس دارفانی سے کوچ کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ہندوپاک کی علمی وادبی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ نظم ونثر دونوں میدانوں میں آپ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ آپ کی وفات ہندوستان کے علمی وادبی حلقوں، بالخصوص اسلام پسند حلقوں کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔ مرحوم کی خاص بات یہ تھی کہ آپ ملت اسلامیہ ہند کے تقریبا ہر مکتب فکر میں مقبولیت رکھتے تھے، اورآپ کی تصانیف بھی تقریباً ہر مکتب فکر میں شوق کے ہاتھوں لی جاتی ہیں۔ جامعۃ الفلاح سے بھی آپ کا کافی گہرا رشتہ تھا۔ جامعہ کے لیے ترانہ 'ہم ہیں پروانے تیرے شمع ضیابار فلاح، ہے ہمالہ سے بھی اونچا میرا مینار فلاح' بھی آپ ہی نے لکھا تھا۔

(باقی صفحہ ۷۳ پر)

غزل

جس کے ہاتھوں میں کبریائی ہے
میں نے اس سے ہی لو لگائی ہے
رات کو دن نہیں کہا میں نے
بس اسی بات پر لڑائی ہے
میرے دشمن سے ربط ہے اس کا
ہائے کیسا عجیب بھائی ہے
وہ جو پوچھے گا مجھ سے کہہ دوں گا
میرا ایماں مری کمائی ہے
جرم تو یہ ہے میں نے منصف کی
کوئی قیمت نہیں لگائی ہے
میں تو پیاسا تھا اب بھی پیاسا ہوں
ساقیا تو نے کیا پلائی ہے
داد کی بھیک مانگنا بھی ضمیر
ایک پہلو سے جگ ہنسائی ہے

ضمیر اللہ ضمیر فلاحی،
ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی

فارغین جامعہ متوجہ ہوں!

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا انتخاب برائے میقات ۲۰۱۴ء تا ۲۰۱۶ء حسب ذیل شیڈول کے تحت ہونا طے پایا ہے:

ممبر سازی کی آخری تاریخ:	۳۰/ستمبر ۲۰۱۳ء
حلقوں کی تعیین اور بیلٹ پیپرس کی ترسیل:	۴/اکتوبر ۲۰۱۳ء
نمائندگان کے لیے آراء بھیجنے کا دورانیہ:	۷/اکتوبر تا ۷/نومبر ۲۰۱۳ء
نومنتخب ارکان نمائندگان کا اعلان:	۱۰/نومبر ۲۰۱۳ء
اجلاس نمائندگان برائے مرکزی انتخاب:	۱۴/تا ۱۵/دسمبر ۲۰۱۳ء

الیکشن کوآرڈی نیٹر:

مولانا انعام اللہ فلاحی (دہلی)

موبائل نمبر: ۸۱۳۰۹۵۹۰۴۵

معاون کوآرڈی نیٹر:

مولانا مقبول احمد فلاحی (جامعۃ الفلاح)

موبائل نمبر: ۹۶۹۵۲۶۹۴۵۳

ممبر فارمس اور آراء بھیجنے کا پتہ:

دفتر انجمن طلبہ قدیم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ یوپی۔ ۲۷۶۱۲۱

ہر تحریکی لائبریری کے لیے مفید اور کارکنان تحریک کے لیے

انمول اور لاجواب تحفہ

مشاہدات

میاں طفیل محمدؒ

مشاہدات دعوتِ دین کی تاریخ اور عملی جدوجہد کی معلومات افزا روداد ہے، جس کا مطالعہ کرتے وقت قاری نہ صرف دعوتِ دین کے کاموں سے اپنی وابستگی کو پختہ بنانے میں اعانت حاصل کرے گا، بلکہ اسے حکمت و دانش کے وہ گہرہائے تاب دار بھی ملیں گے، کہ جن سے کارِ جہاد کے راستے جگمگا اُٹھیں گے۔

پروفیسر خورشید احمد

مشاہدات میں پیش کیا جانے والا میرا یہ طویل انٹرویو اس اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے کہ، یہ کسی وقتی یا ہنگامی ضرورت کے تحت قلم بند نہیں کیا گیا، بلکہ اس مکالمے میں جماعت اسلامی کی دعوت، مولانا مودودیؒ کی شخصیت، جماعت کی تاریخ، پالیسیوں، قومی مسائل و معاملات اور میری ذاتی زندگی کے بارے میں متعدد بنیادی معلومات کو یکجا کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

میاں طفیل محمدؒ

ناشر: اِدارۂ معارفِ اسلامی، لاہور قیمت: -/450 ₹

منشورات

پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

E-61، اسکالر اپارٹمنٹ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر،
نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵ فون: 9810650228, 9212135335
ای میل: manshuratindia@gmail.com
ویب سائٹ: www.manshurat.in

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلی شرز اور دیگر تحریکی اداروں کی مطبوعات ہمارے یہاں سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔